میرے نزدیک چونکہ یہ روایت بارگاہِ رسالت کی عظمتوں کے منافی تھی، اس لیے میں نے اس کے رد اور ابطال میں کافی تفصیل اور تحقیق سے گفتگو کی ہے۔ میں اس پر بہت عرصہ غور و فکر کرتا رہا ہوں۔ سب سے پہلے میں نے یہ بحث ابریز میں پڑھی جس میں سیدی غوث عبدالعزیز دباغ قدس سرہ نے اس روایت کو باطل اور موضوع قرار دیا اور سورۂ حج کی زیر بحث آیت: ۵۲ کا صحیح محمل بیان کیا۔ اس کے بعد میں اس پر مسلسل مطالعہ کرتا رہا۔ میں نے اپنے معاصر علماء سے اس روایت کے بارے میں مذاکرہ بھی کیا۔ میں نے دیکھا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی اتباع میں بعض جید علماء نے بھی اس موضوع روایت کو اس باطل تاویل کے سہارے اختیار کر لیا ہے، جس کو ابھی ہم نے حافظ ابن حجر عسقلانی کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ تاہم یہ علماء صحیح العقیدہ ہیں اور ان کی نیت فاسد نہیں ہے صرف روایت پرستی کے روگ کی وجہ سے انہوں نے اس روایت کو اس باطل تاویل کے ساتھ اپنی تصانیف میں درج کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور مصنف کے دل میں محبت رسول ﷺ کو اور زیادہ کر دے۔ اے اللہ! تو گواہ ہے کہ میں شخصیت پرست نہیں ہوں، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی حرمت سے بڑھ کر مجھے کسی کی حرمت عزیز نہیں ہے۔ میں نے جو یہ سعی کی ہے وہ صرف اور صرف مقام رسول ﷺ کے تحفظ کی خاطر کی ہے۔ اے اللہ اس کوشش کو قبول فرما اور اس کو مصنف کے لیے توشۂ آخرت اور مغفرت اور رحمت کا ذریعہ بنا دے، مصنف کو بیش از بیش خدمت دین کی توفیق دے اور اس کا ایمان پر خاتمہ فرما اور دارین کی نعمتیں اور سعادتیں اس کا مقدر کر دے۔

حسبہ بل

۱۸ ستمبر ۲۰۰۶ کو ہم ٹی وی کے ایک معروف پروگرام Spot Light میں حسبہ بل کے موضوع پر ایک ٹاک شو ریکارڈ ہوا، جو ۲۰ دسمبر ۲۰۰۶ کو نشر ہوا۔ مجلس تفسیر کے سربراہ ڈاکٹر شکیل اوج نے حسبہ بل پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حسبہ بل میں محتسب اعلیٰ کو وہ اختیار دیا گیا ہے، جو آئین پاکستان کی رو سے صرف سپریم کورٹ آف پاکستان کو حاصل ہے۔ مطلب یہ کہ اگر کوئی مقدمہ یا معاملہ محتسب اعلیٰ کی عدالت میں زیر سماعت ہو تو اسے نہ تو صوبہ کی عدالت عالیہ میں چیلنج کیا جا سکتا ہے اور نہ سپریم کورٹ آف پاکستان میں اور نہ ہی فیڈرل شریعت کورٹ میں۔۔۔ اس طرح حسبہ بل کے نفاذ کے بعد ایک Extra Judiciary ہی نہیں بلکہ Parallel Judiciary کا نظام قائم ہو جائے گا۔۔۔ اور یہ ایسی عدالتی خود مختاری ہوگی، جسکی نظیر اگر دیگر صوبوں میں بھی قائم کر دی جائے تو ملک کی عدالتی وحدت کا نظام ٹوٹ جائے گا۔ اس پینل ڈسکشن میں عدالت عالیہ سندھ کے سابق جج مسٹر جسٹس شائق عثمانی، سابق وفاقی وزیر حاجی حنیف طیب اور ہیومن رائٹس ایکٹوسٹ خاتون نے بھی حصہ لیا۔ اینکر کے فرائض مشہور صحافی مظہر عباس نے انجام دیے۔

(رپورٹ: شاکر حسین خان)

نبی اُمّی قرآن کی روشنی میں

علامہ تمنا عمادی

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم ایته ویزکیهم و یعلمهم الکتب والحکمة (سورۃ الجمعۃ: ۲)

وہی (اللہ تعالیٰ ہی) ہے جس نے امیوں میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا تاکہ وہ ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھ کر سنایا کریں اور ان کو پاک نفس بنائے اور (اللہ تعالیٰ کی) کتاب و حکمت کی تعلیم کرتے رہیں۔

واذ یرفع ابراهیم القواعد من البیت واسمعیل ربنا تقبل منا، انک انت السمیع العلیم۔ (سورۃ البقرۃ ۲۔۱۲۷)

(وہ بھی کیا وقت تھا) جب ابراہیم علیہ السلام اس گھر (کعبہ مکرمہ) کی دیواریں اٹھا رہے تھے اور اسمٰعیل علیہ السلام (بھی ان کے ساتھ، دونوں دعائیں کرتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے رب ہم دونوں سے (اس خدمت کو) قبول فرمالے۔ تو (دعاؤں کا) سننے والا (دل کی نیتوں کا) جاننے والا ہے۔

ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امة مسلمة لک وارنا مناسکنا وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۲۸)

اور ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہم دونوں کی نسل سے ایک بڑی امت اپنی فرمانبردار تیار کر دے اور ہمیں بتا دے عبادت کے (وہ) طریقے (جو) ہمارے مناسب ہوں اور ہم لوگوں کی کوتاہیوں اور لغزشوں سے درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم ایٰتک و یعلمھم الکتٰب والحکمۃ و یزکیھم انک انت العزیز الحکیم۔ (سورۃ البقرۃ:۱۲۹)

اے ہم دونوں کے رب اور ان (ہم دونوں کی نسل والی امت کے) لوگوں میں ایک رسول انہیں میں سے مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنایا کرے اور ان کو (تیری) کتاب اور حکمت کی تعلیم کرے اور ان کو پاک نفس بنائے۔ تو ہی عزت و حکمت کا مالک ہے۔

سورہ بقرہ کی تین آیتیں مسلسل ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹ میں نے ترجمے کے ساتھ پیش کر دی ہیں اور یہ مقالہ شروع کیا ہے۔ سورہ جمعہ کی دوسری آیت سے۔ سورہ بقرہ کی ان تینوں آیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان میں سے آخری یعنی ۲:۱۲۹ کو سورہ جمعہ کی آیت سے ملا کر دیکھیے۔

بنی اسرائیل اپنی کتابوں کی پیشین گوئیوں کی وجہ سے آخری نبی کے منتظر ضرور تھے ان کے عوام برابر غیر بنی اسرائیل مشرکین کو اور ان کے موحدین مشرکین بنی اسرائیل کو آخری نبی کی آمد کی پیشین گوئیاں سنا سنا کر ڈرایا کرتے تھے کہ وقت آ گیا ہے۔ آخری نبی کے آنے کا۔ انہیں آنے دو تم کو تمہارے مشرکانہ اعمال اور بداعمالیوں کی سزا مل جائے گی۔ مگر وہ سمجھتے تھے کہ وہ آخری نبی بھی بنی اسرائیل ہی میں سے مبعوث ہوں گے۔ مگر آئے بنی اسمٰعیل میں۔ یہ بات عامہ بنی اسرائیل کو سخت ناگوار ہوئی تو انکار و کفر پر آمادہ ہو گئے۔

وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاء ھم ما عرفوا کفروا بہ (سورۃ البقرۃ:۸۹)

وہ بنی اسرائیل بعثت نبوی سے پہلے آخری نبی کے مبعوث کیے جانے کی اور (ان کے ذریعے) کافروں پر فتح حاصل ہونے کی دعائیں کرتے رہتے تھے۔ مگر جس کو وہ (اچھی طرح) پہچانتے تھے جب وقت آ گیا تو اب اس کو ماننے سے انکار کرنے لگے۔

اور ان کا یہ انکار کسی برہان و دلیل کی بناء پر یا شک و شبہ کی بناء پر نہ تھا۔ بلکہ ارشاد ہے کہ:

بغیا ان ینزل اللہ من فضلہ علی من یشاء من عبادہ (سورۃ البقرۃ:۹۰)

(یعنی بنی اسرائیل نے جو رسول اللہ ﷺ کو رسول برحق تسلیم کرنے سے انکار کیا وہ محض) ضد کی بناء پر کہ (اللہ تعالیٰ نے ان کی توقع کے مطابق آخری نبی کو کیوں مبعوث نہ کیا؟ ان کے نزدیک۔ یہ ٹھیک نہیں ہوا کہ) اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے (خود) جس پر چاہا اپنا فضل (اپنی کتاب) نازل فرمائے۔

غرض بنی اسرائیل کا انکار و کفر محض حسدا من عند انفسھم من بعد ما تبین لھم

الحق (سورۃ البقرۃ:۱۰۹)

یعنی صرف نفسانی جذبہ حسد کے سبب تھا باوجود اس کے کہ حق بات ان پر واضح ہو چکی تھی مگر وہ اس حسد سے کہ یہ آخری نبی بنی اسرائیل میں کیوں آئے۔

بنی اسرائیل کی ضد اور ہٹ دھرمی کے باوجود محض اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ نے تعمیر کعبہ مکرمہ کے وقت جو دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت اسماعیل علیہ السلام کرتے جاتے تھے اس کا ذکر فرما کر یہ فرما دیا کہ آخری نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مشترکہ دعاؤں کی وجہ سے بنی اسمٰعیل علیہ السلام میں مبعوث ہوئے۔ تو اب حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علی نبینا و علیہما السلام کی مشترکہ دعا والی آیت ۱۲۹ کو اور سورۂ جمعہ کی دوسری آیت ملا کر دیکھیے۔ حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علی نبینا و علیہما السلام کی دعا تھی جو اپنی اولاد یعنی بنی اسماعیل ہی کے لیے کہ انہیں میں سے ایک نبی ان میں مبعوث فرمایا جائے۔ وہ دعا قبول ہو گئی۔ جس کا ذکر بعث فی الامیین رسولا منھم میں فرمایا گیا۔ اور بنی اسماعیل ہی کو الامیین فرمایا گیا۔ کیوں بنی اسماعیل کو الامیین فرمایا گیا؟ اس کی وجہ بھی آپ کلام اللہ ہی سے پوچھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بھی دعا فرمائی تھی:

ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوٰۃ (سورۃ ابراہیم ۱۴-۳۷)

اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد (میں) سے بعض کو ایک ناقابل کاشت وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے رب (اس سے میری کوئی اور غرض نہیں بجز اس کے) تاکہ یہ لوگ نماز (کے نظام) کو قائم رکھیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وادی غیر ذی زرع مکہ معظمہ ہی کو فرمایا تھا جس کے قلب میں بیت اللہ کعبہ مکرمہ ہے اور مکہ مکرمہ کا مشہور و معروف لقب ام القریٰ ہے۔ قرآن مجید میں تو مکہ کا لفظ بھی کہیں مذکور نہیں۔ البتہ بکہ کا لفظ ہے۔ بعض غیر معتبر تفسیری روایتوں میں آ گیا ہے کہ مکہ معظمہ کا ایک نام بکہ بھی ہے۔ تو مفسرین کے لیے ایک روایت میں کسی بات کا ہونا کافی تھا اور اہل لغت تو مفسرین کے بعد پیدا ہوئے۔ جو کچھ مفسرین نے لکھا ہے اہل لغت نے بھی لکھ دیا۔ بکہ دراصل مکہ معظمہ کے ایک صحرا کا نام تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مکہ معظمہ میں تشریف آوری کے قبل سے مشہور تھا جس صحرا میں ان کو بیت اللہ کا پتہ بتا کر اس کو نئے سرے سے تعمیر کا حکم ہوا تھا۔ پہلے اس صحرا میں باہر کے آئے ہوئے تجارتی قافلے برابر ٹھہرا کرتے تھے۔ بکہ کے لغوی معنی خود اہل لغت لکھتے ہیں "جائے ازدحام" بجائے مکہ مکرمہ

سے پہلے اس صحرا میں ہر وقت دو تین تجارتی قافلے آکر ٹھہرتے۔ اس وقت وہاں ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا تھا اور مکہ کے معنی مفزع کے ہیں۔ گویا یہ بلد اس پوری زمین کا مفزع ہے۔ غرض مکہ پورے شہر کا نام ہے اور بکہ اس صحرا کا نام تھا جس میں کعبہ کی تعمیر ہوئی۔ حرم شریف کا پورا احاطہ بکہ ہے۔ غرض قرآن مجید میں مکہ مکرمہ کو ام القریٰ ہی کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ امی کا لفظ اس مرکب اضافی کے مضاف میں یائے نسبت لگا کر بنایا گیا ہے۔ منسوب الیہ مرکب ہو تو طوالت سے بچنے کے لئے اس کے ایک جز میں یائے نسبت لگانا معمول ہے کہ جیسے عبید اللہ المہدی بانی حکومت فاطمیہ کی اولاد اور اس کے متبعین کو عبیدیون کہتے تھے، تاریخ کی کتابوں میں عبیدین کا حال آپ کو ملتا ہے۔ یہاں بھی مضاف میں ہی یائے نسبت لگی ہے۔ اسی طرح عبدالدار سے عبدری ہے۔

مختصر یہ ہے کہ چونکہ ام القریٰ سارے بنی اسرائیل کا آبائی وطن تھا اس لئے سارے بنی اسماعیل فخر کے ساتھ اپنے کو امی کہتے تھے چاہے بعد کو ان کی چند پشت اوپر کے اسلاف مکہ مکرمہ سے منتقل ہو کر بہت دور کسی اور جگہ کیوں نہ سکونت پذیر ہو گئے ہوں۔ مگر وہ اپنی نسبت مکہ مکرمہ سے باقی رکھنے کے لئے اور اپنے بنی اسماعیل ہونے کے ثبوت کے لئے امی ہی اپنے کو کہتے تھے اور کہتے رہے۔

ام القریٰ کا لفظ ایک تو سورۃ انعام کی آیت کریمہ ۹۲ میں آیا ہے۔

وھذا کتب انزلنه مبرك مصدق الذی بین یدیه ولتنذر ام القری
ومن حولها ۔ (سورۃ الانعام:۹۲)

اور یہ بڑی عظمت والی کتاب ہے ہم نے اس کو نازل کیا ہے۔ برکتوں سے بھری ہے۔ اس سے آگے جو (کتابیں اتریں) تھیں ان کی تصدیق کرنے والی ہے۔ (اور یہ اس لئے اتاری گئی ہے) تا کہ تم (اس کے ذریعے) ام القریٰ اور اس کے گرد وپیش کی (بستیوں کے رہنے والوں) کو (شرک اور بداعمالیوں کے برے نتائج سے برابر) ڈراتے رہو۔

دوسرا سورۃ الشوریٰ ہے جس کی ساتویں آیت کریمہ یہ ہے۔

وکذلک او حینا الیک قرانا عربیا لتنذر ام القری ومن حولها (سورۃ الشوریٰ:۷)

اسی لئے (اے رسول) ہم نے تمہاری طرف عربی قرآن کی وحی کی ہے تا کہ ام القریٰ اور اس کے گرد وپیش (کی بستیوں کے رہنے والوں) کو (شرک وبداعمالی کے برے نتائج سے) ڈراتے رہو۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت کئی سال تک مکہ مکرمہ اور اس کے اطراف وجوانب کی بستیوں کی طرف تھی۔ اس کے بعد وحی آئی:

قل یایها الناس انی رسول الله الیکم جمیعا (سورۃ الاعراف ۷۔۱۵۸)

(آپ اے رسول) عام اعلان کر دو کہ اے عالم انسانیت والو! میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

مذکورہ بالا آیات کریمات سے یہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ قرآن مجید میں مکہ معظمہ کو ام القریٰ فرمایا گیا ہے اور بنی اسماعیل کا چونکہ آبائی وطن حضرت اسماعیل علیہ السلام کے وقت سے ام القریٰ رہا اور وہ مکہ معظمہ اور حوالی مکہ معظمہ میں بہت بڑی تعداد میں آباد بھی تھے۔ اس لئے بنی اسماعیل کو امیین فرمایا گیا ہے۔

غیر اہل کتاب ہونا

بنی اسماعیل کے پاس بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کے خلفاء رضی اللہ عنہم کے زمانے میں صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو جو کتاب دی گئی تھی ایک مدت تک وہ سارے ہدایت نامے موجود تھے۔ صحف ابراہیم علیہ السلام کا ذکر تو قرآن مجید میں موجود ہے۔ (سورۃ اعلیٰ کی آخری آیت میں) اور سورۃ بقرۃ آیت ۱۳۶ میں ہے۔

وما انزل الی ابراهم و اسمعیل و اسحق و یعقوب والاسباط (سورۃ البقرۃ ۲۔۱۳۶)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وحی کتاب یا صحیفے کی صورت میں یا جس شکل میں بھی ہو ان میں سے ہر ایک پر نازل ہوئی تھی۔ اس لئے بنی اسماعیل کو کتاب اللہ سے محروم ہرگز نہیں رکھا گیا تھا۔

مگر بنی اسرائیل میں برابر بعثت انبیاء کا سلسلہ جاری رہا متعدد کتابیں بھی یکے بعد دیگرے اترتی رہیں۔ ضائع شدہ کتاب کسی نبی نے آکر درست کر دی۔۔۔۔ حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام بنی اسرائیل کے خاتم الانبیاء تھے ان کے بعد بنی اسرائیل میں کوئی نبی تو نہیں آیا مگر تورات وزبور یہود ونصاریٰ کی متفق علیہ کتابیں تھیں اور ہیں۔ تحریفیں تو اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کے اعتبار سے دونوں نے کیں مگر محرف ہی سہی، دونوں کتابیں دونوں کے پاس موجود تو رہیں۔ انجیل سے تعلق صرف نصاریٰ کا تھا اور ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ حضرت موسیٰ وحضرت داؤد علیہ السلام کی کتابیں تو رکھتے اور اپنے نبی کی کتاب نہ رکھتے۔ تحریفیں تو حسب عادت اس میں بھی بہت کیں۔ مگر محرف ہی سہی انجیل کو بھی سینے سے لگائے رہے۔ مگر بنی اسماعیل میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد حضرت خاتم النبیین ﷺ سے پہلے کوئی نبی نہ آیا۔ اس لئے ان کے پاس نہ صحف ابراہیم علیہ السلام رہے نہ حضرت اسماعیل علیہ السلام پر اتری ہوئی کتاب رہی۔

بنی اسماعیل صدیوں تک کتاب اللہ سے بالکل محروم ہو گئے، اور بت پرستی میں انہماک کی وجہ سے ملت ابراہیمی کی کوئی بات ان میں باقی نہ رہی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت اسماعیل علیہ السلام کا احترام تو دلوں میں تھا مگر دینی مسلک کے اعتبار سے بنی اسماعیل کو دور کا بھی کوئی لگاؤ ان بزرگواروں سے باقی نہ رہا تھا۔

مدینہ طیبہ ہجرت کے بعد یہودیوں سے رسول اللہ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نیا سابقہ پیش آیا۔ امیین کی طرف تو آپ ﷺ کی پہلی بعثت ہوئی تھی۔ تیرہ برس مسلسل انہیں میں تبلیغ کرتے رہے۔ انہیں میں سے مؤمنین کی ایک معقول جماعت تیار ہو گئی جس میں سے بہت بڑی جماعت ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آ گئی تھی۔ مگر خود بھی مدینے میں پہلے سے بنی اسماعیل امیین کی بہت بڑی جماعت آباد تھی۔ مدینہ طیبہ کے دو مشہور قبیلے اوس و خزرج امیین ہی میں سے تھے یعنی بنی اسماعیل ہی تھے۔ اعراب جو مدینہ طیبہ کے گرد و پیش کی بستیوں میں رہتے تھے وہ سب امیین ہی تھے۔ مدینہ طیبہ کے انصاری صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب امیین ہی تھے۔ مگر امیین سے کوئی نیا سابقہ نہ تھا۔ نیا سابقہ مدینہ طیبہ میں یہودیوں سے پیش آیا۔ اس لئے مدینہ طیبہ میں جو پہلا سورہ اترا یعنی سورۂ بقرۃ تو اس میں پہلے تین جماعتوں کا ذکر فرمایا گیا۔ مکہ معظمہ میں صرف دو جماعتیں تھیں۔ مؤمنین تھے یا کفار۔ مگر مدینہ طیبہ میں ایک بڑی بھاری تعداد مہاجرین کی آ گئی۔ پھر انصار مہاجرین کی یکجائی سے مؤمنین کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ اس لئے مدینہ طیبہ کے بدنصیب کفار مؤمنین کی مدینہ طیبہ میں امان اور گہما گہمی دیکھ کر مرعوب ہو گئے اور اپنی بدطینتی کے باعث اسلام قبول کرنے پر بھی دل سے آمادہ نہ ہوئے تو انہوں نے منافقت اختیار کر لی، اور بظاہر مسلم بنے مگر دل میں اپنے کفر چھپائے رکھا۔ مسلمانوں سے مسلمان بن کر ملتے تھے اور کفار سے کافر بن کر اس لئے مدینے میں تین جماعتوں سے قرآن مجید کا سابقہ پیش آیا۔ مؤمنین و کافرین کے علاوہ منافقین کی نئی جماعت سے بھی۔ اس لئے سورۂ بقرۃ کی ابتدائی تمہیدی آیات کریمات میں پہلے مؤمنین کا ذکر فرمانے کے بعد کفار کا ذکر فرمایا گیا۔ اس کے بعد منافقین کا، اور یہ سب امیین ہی میں سے تھے۔ اس کے بعد یاایھا الناس کے پرعظمت انداز مخاطبت سے پورے عالم انسانیت کو مخاطب فرما کر توحید کی تبلیغ فرمائی گئی اور شرک جیسے ظلم عظیم سے باز رہنے کی تاکید فرمائی گئی۔ اس کے بعد حضرت آدم علیٰ نبینا و علیہ السلام کے واقعات بیان فرمائے گئے۔ چونکہ بنی اسرائیل کی کتابوں میں یہ سارے واقعات مذکور ہیں۔ وہ زبان سے تصدیق نہ کریں مگر ان کے قلوب تو ضرور ان باتوں کی تصدیق کریں گے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کو خاص طور پر پکار پکار کر مخاطب کیا گیا اور ان کو سمجھایا گیا ان کی گذشتہ نافرمانیاں اور سرکشیاں جو انہوں نے

اپنے رسول ﷺ کے ساتھ کی تھیں ان کو یاد دلائی گئیں۔ مگر مدینہ طیبہ میں ہجرت نبوی ﷺ سے پہلے یہود اپنا اقتدار قائم کئے ہوئے تھے۔ امیین یعنی بنی اسماعیل مدینہ و اطراف مدینہ میں بہت تھے مگر قبائل میں بٹے ہوئے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ امیین کے دو بڑے قبیلے اوس اور خزرج ایک دوسرے کے دشمن تھے اور یہود ان کو آپس میں لڑاتے رہتے تھے۔ اکثر یہود کا خیال یہ تھا کہ امیین بنی اسماعیل کو باہم لڑاتے رہنا ان کو باہمی مسلسل خونریزی کے ذریعے کمزور بنائے رکھنا، بلکہ ان کے ساتھ خیانت کرنا، ان پر ظلم کرنا ہمارے لئے جائز ہے۔ اس کے متعلق اللہ ہم سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کرے گا۔ ان کا قول قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

ومن اھل الکتاب من ان تامنه بقنطار یؤدہ الیک ، ومنھم من ان تامنه بدینار لا یؤدہ الیک الا ما دمت علیه قائما ، ذلک بانھم قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل ، ویقولون علی اللہ الکذب وھم یعلمون ۔ (سورۃ آل عمران ۳:۷۵)

اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان کے پاس مال کا ایک ڈھیر بھی امانت رکھ دو تو وہ (تمہارے مطالبے کے وقت) اس کو تمہیں دے دیں گے اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جن کے پاس تم ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو تمہیں واپس دینے کے لئے تیار نہ ہوں گے مگر یہ کہ تم ان پر (قوت کے ساتھ) مسلط ہو جاؤ۔ یہ بدمعاملگی (ان میں) اس لئے ہے کہ امیوں (بنی اسماعیل) کے بارے میں ہم پر کوئی مواخذہ عائد نہیں ہوگا۔ (یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو امیوں کے ساتھ بددیانتی اور ظلم کرنے کی اجازت دے دی ہے) بلکہ وہ جانتے بوجھتے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں۔

بدسے بدتر اور ظالم سے ظالم قوم میں سے بھی کچھ نیک فطرت افراد ضرور ہوتے ہیں مگر عموماً اچھے لوگ تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وقلیل من عبادی الشکور (سورۃ سبا ۳۴:۱۳)

میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہی سے ہیں۔

اس لئے دو طرح کے اہل کتاب کی جو اخلاقی حالت بیان کی گئی ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ اہل کتاب سے یہاں صرف یہودی مراد ہوں۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں اہل الکتب لفظ عام رکھا گیا ہے جن میں یہود و نصاریٰ دونوں داخل ہیں۔ حسن معاملہ والوں کا جو پہلے ذکر ہے ان سے نصاریٰ مراد ہوں، اور بدمعاملہ جن کا ذکر بعد کو ہے ان سے یہود مراد ہوں۔ سورۂ مائدہ کی آیت کریمہ نمبر ۸۲ جو چھٹے پارے کی آخری آیت ہے پڑھئے:

لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین امنوا الیھود والذین اشرکوا، ولتجدن اقربھم مودۃ للذین امنوا الذین قالوا انا نصریٰ، ذٰلک بان منھم قسیسین ورھبانا وانھم لا یستکبرون۔ (سورۃ المآئدہ ۵:۸۲)

مؤمنین کا سب سے سخت ترین دشمن تم یہودیوں کو پاؤ گے اور مشرکین اور (بت پرستوں) کو اور مؤمنین سے محبت میں قریب تر (یہود و مشرکین کے مقابل) تم ان لوگوں کو پاؤ گے۔ جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں اس لئے کہ ان میں (ان کے) علمائے دین ہیں اور درویش لوگ ہیں اور یہ لوگ اپنے کو (سب سے) بڑا نہیں سمجھتے۔

اس آیت کریمہ کی روشنی میں حسن معاملہ والے امانت دار اہل کتاب نصاریٰ ہی نظر آتے ہیں اور بد معاملہ خائن اہل کتاب یہود (واللہ اعلم)

مدینہ طیبہ میں اس وقت یا بنی اسماعیل تھے یا بنی اسرائیل بلکہ درحقیقت پورے حجاز ہی میں بنی اسماعیل یا بنی اسرائیل ہی آباد تھے اس لیے یہ کہنا کہ بنی اسرائیل غیر بنی اسرائیل کو امیین کہتے تھے اور یہ کہنا کہ بنی اسرائیل، بنی اسماعیل کو امی کہتے تھے دونوں یکساں ہیں۔ دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔ یعنی عرب کے اہل کتاب بنی اسماعیل کو امیین کہتے تھے اور بنی اسماعیل خود بھی اپنے کو فخر کے ساتھ امیین سمجھتے اور کہتے تھے۔ اور دیکھئے سورۃ آل عمران ہی کی بیسویں آیت میں پڑھئے۔

و قل للذین اوتوا الکتٰب والامیین ءاسلمتم، فان اسلموا فقد اھتدوا۔ (آل عمران: ۲۰)
اور (اے رسول ﷺ!) تم اہل کتاب سے اور امیین سے پوچھو کہ کیا تم نے اسلام قبول کر لیا؟ تو اگر انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو وہ ہدایت پا گئے۔

چونکہ اس زمانے میں بھی بنی اسرائیل، یعنی اہل کتاب اور امیین بنی اسماعیل، یہی دو قومیں مدینہ طیبہ اور اسکے گرد و پیش کی بستیوں میں تھیں اس لئے بنی اسرائیل کو الذین اوتوا الکتٰب کے لفظ سے ذکر فرمایا گیا۔ اور بنی اسماعیل کو الامیین کے لفظ سے، پورے حجاز میں دو قومیں آباد تھیں۔ اس وقت حضرت خاتم النبیین ﷺ کے مبعوث الیہم تبلیغی مخاطب یہی دو برابر کی قومیں تھیں۔ اہل کتاب یعنی بنی اسرائیل اور امیین یعنی بنی اسماعیل، اسی لیے ان دونوں کو اس آیت کریمہ میں مخاطب کرنے کا آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کوئی اور تیسری قوم ان دونوں کے سوا حجاز میں آبادی نہ تھی۔ کچھ افراد اگر باہر سے آکر تجارت وغیرہ کے ذریعے یا تو اسی قسم کے لوگ انفرادی حیثیت سے حجاز کی کسی بستی میں بلکہ مدینہ طیبہ و مکہ معظمہ میں بھی علیحدہ یا کسی قبیلے کے بعض افراد کے ساتھ سکونت پذیر ہوں تو ضمناً وہ بھی اس مخاطبت کے مخاطب سمجھے جائیں

گے۔ مگر ضمناً ہی مخاطب ہو سکتے ہیں، ان لوگوں کی اپنی کوئی جداگانہ مستقل قومی حیثیت نہیں سمجھی جا سکتی کہ وہاں وہ بھی اہل کتاب اور امیین کی طرح کسی اور قومی نام سے مخاطب ہوتے۔

لا یعلمون الکتٰب

سورۃ بقرہ کے نویں رکوع میں اہل کتاب یعنی مدینہ طیبہ کے یہودیوں کی سنگدلی، بے ایمانی اور ہٹ دھرمی کا ذکر کرتے ہوئے مؤمنین سے فرمایا گیا ہے کہ:

افتطمعون ان یؤمنوا لکم (سورۃ البقرۃ ۲:۷۵)

کیا تم ان سے امید رکھتے ہو کہ یہ تمہاری بات مان لیں گے؟ یہ ایسے ہٹ دھرم ہیں کہ اپنی کتاب میں بھی وہ باتیں جو ان سے کہی گئی ہیں۔ ان میں جو باتیں ان کی مرضی کے خلاف پڑتی ہیں یہ ناخدا ترس ان میں بھی ردوبدل کر دیا کرتے ہیں۔ جس کتاب پر ایمان ہے اس میں بھی تحریف کرتے رہتے ہیں۔

اسی سلسلہ کلام میں بطور جملہ معترضہ کے امیین کا بھی ذکر فرما دیا گیا ہے۔ چونکہ مدینہ طیبہ میں یہودیوں کے ساتھ یہ بھی انکار و کفر و مخالفت میں یہودیوں کے ہمنوا و شریک کار تھے مگر بحث و مناظرہ کا تعلق ان سے کیا ہوتا۔ ان کے پاس زبانی کٹ حجتی کے سوا تھا ہی کیا۔ یہودیوں سے البتہ بحثیں ہوتی تھیں اور تورات کی باتیں پیش کر کے ان کو قائل کیا جاتا تھا۔ اس لئے یہود مدینہ کی ہٹ دھرمیوں کے سلسلہ ذکر میں فرمایا گیا ہے۔

ومنھم امیون لا یعلمون الکتٰب الا امانی وان ھم الا یظنون (سورۃ البقرۃ ۲:۷۸)

یعنی ان منکرین مخالفین کے زمرے میں امیین بھی ہیں۔ مگر وہ کسی آسمانی کتاب کو تو جانتے بھی نہیں بجز (وہمی) ہوا و ہوس کے۔ وہ بس صرف بے بنیاد باتوں پر چلتے ہیں۔ چونکہ مدینہ طیبہ میں امیین کی بھی ایک بہت بڑی جماعت موجود تھی اور حوالی مدینہ میں امیین ہی کی اکثریت تھی اس لئے ان کو نظر انداز کس طرح کیا جا سکتا تھا۔ ان کا ذکر بالکل نہ کرنا باوجود ان کے قابل ذکر نہ ہونے کے مناسب نہ تھا۔ بدیں وجہ اثنائے ذکر یہود میں مختصر لفظوں میں امیین کا ذکر کر کے ان کے قابل ذکر نہ ہونے کی وجہ بھی بیان فرما دی کہ نہ ان کے پاس کوئی کتاب ہے نہ دوسری قوموں کی کتابوں کا علم رکھتے ہیں نہ ان کو سند سمجھ کر ان کتابوں کی باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ صرف وہمی امیدوں اٹکل پچو اوہام و ظنون ہی پر ان کے دین کا دارومدار ہے جن کو عقلی دلائل سے بھی کوئی مناسبت نہیں تو ان اوہام پرستوں کے متعلق کیا باتیں کی

جائیں اور ان کی کوئی سی بات اس قابل ہے کہ اس کی تردید ضروری سمجھی جائے۔ اس لئے مختصر مگر بلیغ جملے میں امیون کا ذکر فرما کر پھر یہودی کے حالات بیان فرمائے گئے۔ اس آیت کریمہ سے امیین کی دینی حیثیت واضح فرمادی گئی کہ ظنون واوہام کے سوا ان کا دینی سرمایہ کچھ نہ تھا۔ پورے قرآن مجید میں از روئے نحو باعراب رفع امیون کا لفظ اسی آیت کریمہ میں آیا ہے۔ اس کے سوا تین جگہ باعراب جر امیین کا لفظ آیا ہے۔ سورۃ اعراف کی آیت کریمہ ۱۵۷، ۱۵۸ دونوں میں یکے بعد دیگرے اور پھر سورۃ جمعہ کی دوسری آیت کریمہ میں، جو بتوفیقہ تعالیٰ و تبارک ان چاروں آیتوں پر اور لفظ امیین کی معنوی اور قوم امیین کی نسبی و وطنی حیثیت اور وجہ تسمیہ اور پھر ان کی دینی بے بضاعتی سب پر بحث ہو چکی۔ فالحمد للہ

النبی الامی

قرآن مجید میں دو جگہ یہ عظمت مآب مرکب توصیفی آیا ہے۔ ایک ہی سورۃ میں ایک ہی سلسلہ کلام میں ایک ہی جگہ پے در پے دو آیتوں میں یعنی سورۃ اعراف کی آیت کریمہ ۱۵۷ میں اور آیت کریمہ ۱۵۸ میں وہ دونوں آیت کریمہ بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ السلام کے بعض اہم واقعات سے متعلق ہیں۔ اس لئے پوری دونوں آیتوں کا لکھنا بھی کافی نہ ہوگا۔ کم سے کم آیت کریمہ ۱۵۵ سے ۱۵۸ تک لکھ کر ترجمہ ہی نہیں بلکہ پوری تفسیر لکھنی ہوگی اور جن واقعات کا ان آیتوں میں ذکر ہے ان کو وضاحت سے سمجھنا ہوگا۔ جس سے غلط بحث بھی ہوگا۔ اس وقت تو مجھ کو صرف یہ دکھانا ہے کہ قرآن مجید میں جو دو جگہ رسول اللہ ﷺ کو النبی الامی فرمایا گیا ہے وہاں ان آیتوں میں النبی الامی کے معنی کیا ہیں؟ اس لئے سورۃ اعراف کی ان دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت بقدر ضرورت ہی عبارت پیش کرتا ہوں، دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت ۱۵۷ کا پہلا جملہ ہے۔

الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی
التورۃ والانجیل (سورۃ الاعراف:۱۵۷)

وہ لوگ جو پیروی کریں گے امی (قوم کے) رسول نبی کی جن (کی نشانیوں) کو وہ تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

اور پوری آیت ۱۵۸ اس طرح ہے۔

قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا ن الذی لہ ملک السموت والارض ج لا الہ الا ھو یحی و یمیت فامنوا باللہ ورسولہ النبی الامی الذی یومن باللہ وکلمتہ واتبعوہ لعلکم تھتدون ۔(سورۃ الاعراف:۱۵۸)

(اے رسول ﷺ!) اعلان کردو کہ اے سارے جن وانس! میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں (وہ اللہ) ساری بلندیوں اور ہر پستی میں جس کی بادشاہی وحکومت ہے جس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے۔ تو ایمان لاؤ (اس) اللہ پر اور اس کے رسول امی (قوم کے) نبی پر جو (خود بھی) اللہ تعالیٰ پر اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے اور اس (نبی امی) کی پیروی کرتے رہو تا کہ تم منزل مقصود تک پہنچنے کی راہ پا جاؤ۔

ان دونوں آیتوں میں حضور ﷺ کو النبی الامی فرمایا گیا ہے اور سورۃ جمعہ کی دوسری آیت کریمہ میں آپ ﷺ ہی کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

بعث فی الامیین رسولا منھم

اللہ تعالیٰ نے امی قوم کے لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا۔

اور حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام نے دعا فرمائی تھی ام القریٰ میں بیت اللہ کی تعمیر کرتے ہوئے کہ ہم دونوں کی نسل میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرما۔ اور اسی ام القریٰ میں اپنی نسل کو بسانے کا بھی ذکر ابراہیم علیہ السلام نے دعا ہی میں کیا تھا۔ اور یہ ساری دعائیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی نسل کے لئے فرمائی تھیں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذریعے ام القریٰ میں اس کے حوالی میں پھیلی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام وحضرت اسماعیل علیہ السلام کی مشترکہ دعا جو قبول فرمائی گئی اس کا ذکر اس طرح نہیں فرمایا گیا کہ:

ھو الذی بعث فی ذریۃ ابراھیم و اسمعیل رسولا منھم

کہ اس میں طوالت بیان الگ ہوتی اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی سکونت کا ذکر فرمایا تھا۔ وہ سکونت مذکور نہ ہوتی اور فی الامیین فرماد ینے ہیں۔ ام القریٰ کی سکونت کا ذکر بھی ہو گیا۔ اور ابراہیم علیہ السلام ہی کی نسل وہاں بسائی گئی۔ دعا بھی اسی نسل ابراہیمی واسماعیلی ہی کے لئے کی تھی۔ اس لئے الامیین کہنے سے نسل ابراہیم واسماعیل علیہ السلام ہونا ثابت ہو رہا ہے اور ان کی سکونت ام القریٰ بھی اس سے ثابت ہو رہی ہے۔ انہیں امیین میں سے یہ نبی امی مبعوث ہوئے تو اس صفت امیت سے النبی کا اتصاف اور ان کا۔۔۔ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہونا۔ بنی اسماعیل میں سے ہونا ثابت کر رہا ہے اور ام القریٰ کا ساکن ہونا بھی ثابت کر رہا ہے اور یہ دونوں باتیں باعث شرف اہل عرب کے نزدیک اس وقت ضرور تھیں۔

حجاز کے علاوہ عرب کے دوسرے شہروں میں غیر بنی اسماعیل اور غیر بنی اسرائیل قبائل بھی تھے وہ بنی اسماعیل کا بہت احترام کرتے تھے بنی اسرائیل کے سوا عرب کے سارے قبائل بنی اسماعیل امیین کا احترام کرتے تھے۔ ان کی خاندانی عظمت اور خادم و مجاور بیت اللہ ہونے کی وجہ سے عام طور پر سارے غیر اسرائیلی قبائل عرب بنی اسماعیل کو قابل احترام مانتے تھے اس لئے ہر طرح کے حملہ آوروں سے محفوظ تھے۔ یہاں تک کہ ان کے تجارتی قافلے بھی ڈاکوؤں کے حملے سے محفوظ رہتے تھے۔ ڈاکو بھی ان امیین کا احترام کرتے تھے۔ اس لئے الرسول النبی کے لفظوں سے آنحضرت ﷺ کی عظمت وجلالت منصبی کا اظہار فرمایا گیا اور الامی کے لفظ سے آپ ﷺ کی خاندانی شرافت اور مولد و مسکن کی عظمت بھی بتادی گئی۔ اتنی واضح بات مذکورہ بالا آیات کے ہوتے ہمارے اسلاف صرف ایک جھوٹی اور خلاف عقل روایت پر یقین کر لینے کی وجہ سے بھول گئے۔

ان پڑھ ہونا معجزہ نہیں ہے

قرآن مجید میں صاف طور پر بیان فرمایا گیا ہے کہ:

وما كنت تتلوا من قبله من كتب ولا تخطه بيمينك

اذا لارتاب المبطلون (سورۃ العنکبوت: ۴۸)

(اے رسول ﷺ) اس (منصب) سے پہلے تم کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے۔ (اگر تم لکھے پڑھے ہوتے) تو اس وقت باطل پرست لوگ (طرح طرح سے) شبہے پیدا کرتے۔

حضور ﷺ کے لئے لکھے پڑھے نہ ہونے کا صرف ایک فائدہ بیان فرمایا گیا ہے۔ اگر حضور ﷺ کے لئے ان پڑھ ہونا معجزہ ہوتا تو فرمایا جاتا:

ومن ايات نبوتك انك ما كنت تتلو من قبله من كتب۔ الخ

نہ ہی یہ کوئی معجزہ ہو سکتا ہے۔ البتہ جو شخص چالیس برس تک پوری قوم کا جانا بوجھا ان پڑھ ہو وہ دفعتاً لکھی ہوئی کتاب ہر پڑھنے والے سے بہتر طریقے سے پڑھنے لگے اور اپنے ہاتھ سے بہترین خط میں لکھ کے نمونے دکھانے لگے تو یہ البتہ معجزہ ہوگا۔

نبوت کے بعد ۲۳ برس تک آپ ﷺ کو موقع ملا، اتنی وسیع مدت میں آپ ﷺ کے لئے پڑھنا لکھنا سیکھنا کیا دشوار تھا؟ اہل سیر کے لکھنے کے مطابق نبوت کے بعد ۲۳ برس کا وسیع وقت ملنے کے باوجود بھی تادم وفات آپ ﷺ کا ان پڑھ رہنا معجزہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ اس کو لکھنے پڑھنے کی اہمیت نہ سمجھنا اور لکھنے پڑھنے کی طرف سے بے پروائی ضرور کہا جائے گا۔ متنبی نے خوب کہا ہے:

ولم ار في عيوب الناس شيئا

كنقص القادرين على التمام

یعنی انسانوں کے عیبوں میں سے (بدترین) اس جیسا عیب میں نہیں سمجھتا کہ اپنی تکمیل کی قدرت رکھنے کے باوجود لوگ اپنے نقص پر قانع رہیں۔

غرض منافقین نے ان پڑھ ہونے کو معجزہ قرار دے کر اس کا خوب ڈھنڈورا پیٹا اور طرح طرح سے اس کو مشہور کیا اور لفظ امی کے معنی ہی ان پڑھ قرار دے کر اس کو خوب مشہور کیا اور بعد کو ایک حدیث بھی گھڑ لی۔

امۃ امیۃ

صرف اسود بن قیس النخعی الکوفی سعید بن عمرو بن سعید سے روایت کرتا ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا ہے کہ انہوں نے حدیث بیان فرمائی رسول اللہ ﷺ سے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ:

ان امة امية لا نكتب ولا نحسب الشهر هكذا وهكذا وهكذا و عقد الابهام في الثالثة . والشهر هكذا و هكذا وهكذا يعني تمام ثلاثين

ترجمہ: ہم لوگ امۃ امیۃ (امی قوم) ہیں نہ حساب کرتے ہیں (نہ لکھنا جانتے ہیں نہ گنتی جانتے ہیں) مہینہ اسی طرح ہے اور اس طرح ہے (اپنی دسوں انگلیوں سے کف ہلا ہلا کر بتایا) مگر تیسری بار میں انگوٹھے کو دبا لیا تھا (یعنی ۲۹ کی گنتی ہوئی) پھر (اسی طرح دونوں ہتھیلیوں کی انگلیوں سے کف دست تین بار ہلا ہلا کر بتایا کہ) اور مہینہ اس طرح ہے اور اس طرح ہے اور اس طرح ہے (اب کی بار انگوٹھا نہیں دبایا) تیس پورا کیا۔

یہ حدیث مختلف طریق سے مروی ہے مگر اسود بن قیس ہی سے۔ صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث اسود بن قیس ہی سے مروی ہے۔ یہ اسود بن قیس دراصل اسود بن یزید بن قیس النخعی الکوفی ہے۔ نہایت مفتری تھا۔ کوفے کے بلوائی قاتلین حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا سرغنہ تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی تک چھپا رہا۔ ان کی وفات کے بعد راوی احادیث بن کر نمودار ہوا۔ اس کے شاگردوں نے مشہور کیا کہ اس نے حضرت ابوبکر صدیق وحضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ حج کئے تھے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ اس کا حج کرنا تو ناممکن ہے۔ کیوں کہ اس کی موت بقول ابی اسحاق السبیعی الکوفی ۷۵ھ میں ۶۳ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اس حساب سے اس کی پیدائش ۱۲ھ کی ٹھہرتی ہے۔ قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ کوفے سے بیس برس کی عمر میں جوانی

دوانی کا جوش لئے ہوئے آیا تھا اور بلوائیوں کے سرغنوں میں سے ایک سرغنہ تھا۔

اس سے روایت کرنے والے اس کے ہم مسلک تلامذہ نے اس کی طرف متعدد حج کو منسوب کردیا ہے۔ اس کو بڑا عابد ثابت کرنے کے لئے یہ جھوٹی حدیث جو اس کذاب نے رسول اللہ ﷺ کو طرف منسوب کی ہے اسی سے اس کی منافقت اور کذابیت ثابت ہورہی ہے۔

لیکن یہ یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف جو قول اس افترائی حدیث میں قصداً وعمداً منسوب کیا گیا ہے، اس میں صرف حضور ﷺ ہی کے حساب وکتاب سے نابلد ہونے کا ذکر نہیں ہے بلکہ حضور ﷺ کی پوری قوم کو لکھنے پڑھنے سے، حساب وکتاب وعدد وشمار جاننے سے بالکل نابلد ثابت کیا گیا ہے۔ انا امۃ امیۃ کہہ کر اور اسی افترائی حدیث کی بنیاد پر امی کے معنی ان پڑھ مشہور کیا گیا ہے۔ اس افترائی حدیث کے سوا کوئی دلیل لوگوں کے پاس اس کی نہیں کہ امی اس کو کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو نہ گنتی جانتا ہو۔ تو یہ حدیث مکذوب علی الرسول یہ بتاتی ہے کہ حضور ﷺ تیس اور انتیس کی گنتی تک نہیں جانتے تھے اور لکھنا پڑھنا گنتی اور اعداد کے نام نہ آپ ﷺ جانتے تھے نہ آپ ﷺ کی قوم یعنی بنی اسماعیل علیہ السلام کی پوری قوم جانتی تھی۔ مگر ایسی قابل قوم کے ان پڑھ رسول پر جو کتاب اتری ہے اس میں اعداد کے ناموں کی کثرت دیکھئے۔ ان آیات کو بقول اسود بن قیس الجحی (نعوذ باللہ) خود رسول نہیں سمجھتے ہوں گے۔ دوسروں کو ایسی کتاب کی تعلیم وہ کیا کر سکتے ہیں جس کو وہ خود نہیں سمجھ سکتے تھے۔

ایک: مذکر قل ھو اللہ احد۔ (ایک) مؤنث احدی الطائفتین (انفال) دو گروہوں میں سے ایک

دو: مذکر اثنان ذوا عدل منکم (مائدہ ۱۰۶) دو (گواہ) عدل وانصاف والے تم میں سے۔ دو مؤنث فان کانتا اثنتین (النساء ۱۷۶، آخری آیت) (اگر بے والد ولد میت کے صرف) دو (بہنیں) ہوں۔

تین: مذکر ثلثۃ قروء (بقرۃ ۲۲۸) (مطلقہ بیویوں کی عدت) تین حیض۔ مؤنث فی ظلمت ثلث (زمر ۶) (بچہ ماں کے پیٹ میں) تین (طرح کی) تاریکیوں میں (رہتا ہے)۔

چار: مذکر اربعۃ من الطیر (بقرۃ ۲۶۰) چار پرندوں میں سے لو۔ مؤنث اربع شھدت باللہ (نور: ۸) چار شہادتیں (قسمیں) اللہ تعالیٰ کی۔

پانچ: مذکر و یقولون خمسۃ (الکھف: ۲۲) اور (بعض لوگ اصحاب کہف کے بارے میں کہتے ہیں) کہ پانچ ہیں۔ سادسھم کلبھم ان میں ان کا چھٹا کتا ہے۔

چھ: فی ستۃ ایام۔ چھ دنوں میں (اعراف ۷: ۵۴)

سات: و یقولون سبعۃ وثامنھم کلبھم (کہف ۱۸_۲۲) اور (بعضے اصحاب کہف کے متعلق) کہتے ہیں کہ وہ

سات ہیں۔ آٹھواں ان کا کتا ہے۔

آٹھ: مذکر ثمنیۃ ازواج۔ (انعام: ۱۴۳) آٹھ قسم کے (چار پائے) مؤنث: ثمنی حجج (قصص: ۲۷) آٹھ برس

نو: مذکر تسعۃ رھط (النمل: ۴۸) نو قبیلے (مؤنث) وازدادوا تسعا (کہف: ۲۵) لوگوں نے نو کا اضافہ کردیا۔

دس: مذکر فلہ عشر امثالھا (انعام: ۱۶۰) تو اس کے لیے دو گونہ ہے ویسا ہی ہے۔ مؤنث تلک عشرۃ کاملۃ (بقرۃ: ۱۹۶) یہ پورے دس ہوئے۔

گیارہ: احد عشر کوکبا (یوسف: ۴) گیارہ ستارے۔

بارہ: اثنتا عشرۃ عینا (بقرۃ: ۶۰) بارہ جھرنے

ایک سے بارہ تک مسلسل اعداد اکثر کے مذکر ومؤنث دونوں قرآن مجید میں آپ نے دیکھ لئے۔ ان کے علاوہ انیس کا بھی ذکر ہے۔

علیھا تسعۃ عشر (مدثر: ۳۰) دوزخ پر انیس فرشتے مقرر ہیں۔

اس کے علاوہ مثنیٰ وثلث وربع (النساء ۳) دو، دو تین تین اور چار چار پھر آیات وراثت میں نصف میراث اور ثمث اور ربع اور ثمن (آدھا، تہائی دو تہائی، چوتھائی، اور آٹھویں حصہ کا حساب) تقسیم میراث کے سلسلے میں ایسے بھولے بھالے رسول کس طرح کر سکتے ہوں گے جو تیس اور انتیس کی گنتی تک نہ جانتے ہوں اور پوری قوم تو ضرور اپنے رسول سے زیادہ ہی بھولے پن میں ہوگی۔ وہ تقسیم میراث کی آیات (مذکورہ بالا آیات) کو کس طرح سمجھی ہوگی؟

جتنے اعداد بیان کئے گئے وہ آحاد کے ہوئے یا پہلا عشرہ اور اس کے کچھ لواحق ان کے علاوہ بڑے بڑے اعداد بھی ہیں انہیں بھی دیکھ لیجئے۔

دس: ولیال عشر (فجر ۲:) اور دس راتیں گواہ ہیں۔

بیس: ان یکن منکم عشرون (انفال: ۶۵) اگر تم میں سے بیس (مجاہدین) ہوں۔

تیس: وحملہ وفصلہ ثلثون شھرا (احقاف: ۱۵) بچے کے حمل میں رہنے اور پیدائش کے بعد دودھ چھڑانے تک کے وقت کی مدت تیس مہینے بتائی گئی ہے۔

چالیس: اسی آیت کریمہ سورۃ احقاف میں اس پر ہے وبلغ اربعین سنۃ اور پہنچا چالیس برس کی عمر تک۔

پچاس: الا خمسین عاما (عنکبوت: ۱۴) مگر پچاس برس

ساٹھ: ستین مسکینا (مجادلہ ۴:) ساٹھ مسکین

ستر: سبعون ذراعا (الحاقہ: ۳۲) ستر ہاتھ

اسی: ثمانین جلدۃ (نور: ۴) اسی درے

ننانوے: تسع وتسعون نعجۃ (ص: ۲۳) اس کے ننانوے دنبیاں

ایک سو: مائۃ عام (بقرۃ: ۲۵۹) سو برس

دو سو: یغلبوا مائتین (الانفال: ۶۵) غالب آجائیں گے دو سو پر

تین سو: ثلث مائۃ سنین (الکہف: ۲۵) تین سو برس

ایک ہزار: وان یکن منکم الف (الانفال: ۶۶) اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں

دو ہزار: یغلبوا الفین (الانفال: ۶۶) دو ہزار پر غالب آجائیں گے

تین ہزار: بثلثۃ الف (آل عمران: ۱۲۴) تین ہزار (ملائکہ) سے

پانچ ہزار: بخمسۃ الف من الملئکۃ (آل عمران: ۱۲۵) پانچ ہزار فرشتوں سے

پچاس ہزار: خمسین الف سنۃ (معارج: ۴) پچاس ہزار برس

ایک لاکھ: الی مائۃ الف (الصٰفٰت: ۱۴۷) سو ہزار کی طرف

واضح رہے کہ اس کے بعد او یزیدون ہے۔ یہاں آو اضراب کے لئے بلکہ کے معنی میں ہے۔

اللہ گنتی کیجئے

جس رسول ﷺ پر ایسی کتاب اترے جس میں تقریباً ایک سے لے کر ایک لاکھ تک کی گنتی ہو۔ احاد و عشرات اور ان سے مرکب اعداد مذکور ہوں۔ تقسیم میراث کا جس کو حساب بتایا گیا ہو زکوٰۃ و مال غنیمت کی تقسیم کا جس کو قانون بتایا گیا ہو وہ ایسا ہو سکتا ہے کہ نہ پڑھنا لکھنا جانے نہ حساب جانے۔ یہاں تک کہ ایک سے لے کر دس سے زیادہ گنتی بھی نہ جانتا ہو۔ دونوں ہاتھوں میں دس انگلیاں ہیں اسی کے برابر وہ دس تک کسی طرح گن لیتا ہو۔ کیا امی کے یہ معنی نزول قرآن مجید کے وقت اہل عرب خصوصاً اہل حجاز جانتے تھے؟ اور اسی معنی میں رسول اللہ ﷺ کو معاذ اللہ من ذالک بے پڑھا لکھا ان پڑھ جاہل ہی کے معنی میں النبی الامی سورۃ الاعراف کی آیت کریمہ ۱۵۷، ۱۵۸ دونوں میں فرمایا گیا ہے؟

خیال رہے کہ سورۃ اعراف کی ان دونوں آیتوں کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں اور بنی اسرائیل میں علما بھی تھے۔ سورۃ شعراء کے مخاطب مشرکین مکہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

اولم یکن لھم ایۃ ان یعلمہ علمٰؤا بنی اسرائیل (سورۃ الشعرآء ۲۶: ۱۹۷)

کیا (یہ بات) ان (مشرکین مکہ و عوام اہل کتاب) کے لئے (اس قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کی) ایک عظیم علامت نہیں ہے؟ کہ اس (کی باتوں کے برحق ہونے) کو علمائے بنی اسرائیل خوب جانتے ہیں۔

سورۃ الاعراف بھی سورۃ الشعراء کی طرح مکی ہی سورۃ ہے۔ مگر سورۃ الاعراف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متعلق واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ ہیں۔ آیت کریمہ ۱۰۳ سے ۱۶۲ تک مسلسل ساٹھ آیات کریمات کے مخاطب بنی اسرائیل یہود ہی ہو سکتے ہیں اس لئے ان آیات کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ یہ سب مدنی آیتیں ہیں اور یہود مدینہ ان کے مخاطب ہیں۔ خصوصاً اس لئے کہ آیت کریمہ ۱۵۶ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ختم ہوئی ہے۔

واکتب لنا فی ھذہ الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ انا ھدنا الیک (سورۃ الاعراف ۷: ۱۵۶)

اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی مقدر کر دی جائے اور آخرت میں بھی ہم سب نے تجھی سے لو لگا رکھی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کا جواب یہ عطا فرمایا گیا ہے۔

عذابی اصیب بہ من اشآء ورحمتی وسعت کل شیء

میرا عذاب، تو جس کو میں (اس کا) مستحق سمجھتا ہوں اسی پر نازل کرتا ہوں اور میری رحمت تو ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا جواب یہاں پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد یعنی اس لمبی تمہید کے بعد بنی اسرائیل ہی کو رسالت محمدیہ ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے۔ ان کے عوام کو نہیں۔ علمائے بنی اسرائیل کو۔

آیت کریمہ ۱۵۶ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی التجاء کے جواب کا آخری جملہ ہے ورحمتی وسعت کل شی اس کے بعد موجودہ یعنی ہجرت نبوی ﷺ کے وقت جو بنی اسرائیل مدینہ طیبہ و حوالی مدینہ طیبہ موجود تھے ان کو اتباع دین محمدی ﷺ کی ترغیب کے لئے ورحمتی وسعت کل شی فرمانے کے بعد فائے استیناف کے ذریعے استدراک کی عطف اس جملے پر کر کے ارشاد ہوا کہ:

فساکتبھا للذین یتقون و یؤتون الزکوٰۃ والذین ھم بایتنا یؤمنون (سورۃ الاعراف: ۱۵۶)

لیکن اب ہم اپنی رحمت کو لازم کر دیں گے ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے رہتے ہیں۔ اور ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

تین باتیں فرمائی ہیں:

۱۔ تقویٰ جس کا پتہ حقوق العباد کی نگہداشت سے ملتا ہے۔

۲۔ ادائے زکوٰۃ مالی قربانی نفس پر بہت شاق ہوتی ہے اور مالی ایثار کرنے کا حکم دینا بھی ایمانی آزمائش کا اہم ترین ذریعہ ہے۔

۳۔ آخر میں ایمان کا ذکر فرمایا۔ اس لئے کہ ہر جماعت میں بعض نیک نفس ہوتے ہیں۔ فطری نیک نفسی کی وجہ سے حقوق العباد ادا کرتے ہیں۔ مالی قربانی بھی کرتے ہیں۔ لیکن ایمان نہیں رکھتے۔ اس لئے وہ دنیا میں اپنی نیک نفسی کی وجہ سے نیک نام و ہر دل عزیز ضرور رہیں گے اور دنیاوی خوشحالی ان کو ضرور حاصل ہو گی۔

وما یفعلوا من خیر فلن یکفروہ (سورۃ آل عمران:۱۱۵)

وہ جو نیکی کریں گے اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی۔

لیکن ارشاد فرمایا گیا ہے۔

لا خیر فی کثیر من نجوٰھم الا من امر بصدقۃ اور معروف او اصلاح بین الناس ومن یفعل ذٰلک ابتغاء مرضات اللہ فسوف نؤتیہ اجرا عظیما (سورۃ النساء:۱۱۴)

ان کی باہمی مشاورت کی مجلسوں میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی بجز اس کے کہ کوئی (اس میں) صدقہ وخیرات کی بات پیش کرے یا کسی اور رفاہ عام کی بات پر لوگوں کے درمیان اصلاح ومصالحت کی تدبیر پر غور وبحث ہو (بے شک یہ سب کار خیر ہیں) لیکن انہی کاموں کو جو شخص ابتغائے مرضاۃ اللہ کی نیت سے کرے گا تو وہ (آخرت کے) اجر عظیم کا مستحق ہوگا (ورنہ دنیاوی مفاد کے لئے جو نیکیاں کرے گا اس کو دنیاوی مفاد حاصل ہو جائے گا)۔

اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔

ومن یرد ثواب الدنیا نؤتہ منھا (سورۃ آل عمران ۳:۱۴۵)

جو شخص (اپنی نیک عملی کا کام میں اجر دنیا ہی کا مفاد چاہے گا ہم اس کو دنیا سے (جو مناسب سمجھیں گے) دے دیں گے۔

مگر یہ بھی فرما دیا ہے۔

فمن الناس من یقول ربنا اٰتنا فی الدنیا وما لہ فی الاخرۃ من خلاق (سورۃ البقرۃ ۲:۲۰۰)

بعض لوگ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس دنیا میں (بھلائیاں) عطا فرما اور (چونکہ وہ

آخرت کے لئے کچھ نہیں کرتے اس لئے) آخرت میں اس کے لئے (خوشحالی میں سے) کوئی حصہ نہیں۔

غرض ایمان کے بغیر ساری نیکیاں آخرت میں کچھ کام نہیں دے سکتیں۔ سب وہاں اکارت ہیں۔ اس لئے یہاں آخر میں ایمان کا ذکر فرمایا گیا۔ نماز کا ذکر نہیں فرمایا اس لئے کہ نماز ہی تو ایمان کا عملی و ظاہری ثبوت ہے۔ ایمان تو دل کی بات ہے۔ نماز ہی کی پابندی ایمان کا ثبوت پیش کرتی ہے۔

اس لئے ایمان کے ذکر کے بعد صلوٰۃ کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔ عیاں راچہ بیاں۔ زکوٰۃ چونکہ "زری طلبی سخن دریں است" والی چیز ہے اس لئے اس کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اس کے بعد بتایا کہ وہ حقی زکوٰۃ ادا کرنے والے آیات اللہ پر ایمان رکھنے والے کون لوگ ہیں؟

الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ والانجیل (سورۃ الاعراف:۱۵۷)

وہ وہ لوگ ہیں جو اس رسول نبی امی کی پیروی کریں گے جن کا ذکر وہ اپنے پاس تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ یعنی علمائے بنی اسرائیل جو تورات وانجیل کا علم رکھتے ہیں۔

جس وقت یہ آیت کریمہ اتری تھی اور مدینے کے یہودیوں نے سنی تھی۔ اگر امی کا لفظ واقعی ان پڑھ، پڑھنے لکھنے سے عاری، گنتیوں کے نام تک جس کو نہ آتے ہوں، ایسے جاہل ہی کے لیے اہل عرب بولتے تھے تو علمائے بنی اسرائیل ضرور کہتے کہ ہم لوگ اہل علم ہیں۔ لکھنا پڑھنا اپنی دینی زبان عبرانی وسریانی میں بھی جانتے ہیں اور ہم پشتہا پشت سے عرب کے رہنے والے ہیں اس لئے عربی زبان میں بھی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ ایک ان پڑھ شخص جس کو گنتی تک نہ آتی ہو، اس کا اتباع کیوں کرنے لگے، اگر صحیح بخاری کی یہ حدیث ان میں مدخولہ نہ ہوتی اور واقعی حضور اس حدیث کے مطابق لانکتب ولا نحسب کے مصداق ہوتے تو یہود خصوصاً علمائے یہود ضرور حضور ﷺ کے ان پڑھ ہونے کا طعن دیتے رہتے اور قرآن مجید میں اس کا ضرور کچھ جواب اترتا۔ کم سے کم تاریخی روایتوں میں یہودیوں کے اس طعن کا ذکر ہوتا اور جس طرح اہل سیر ان پڑھ ہونے کو معجزہ ثابت کر رہے ہیں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین یہودیوں کے طعن کا جواب دیتے۔ اس معجزے کو یہودیوں پر ثابت کرتے اور اس کا ذکر تاریخی روایات میں ہوتا۔

قرآن مجید میں کہیں بھی اشارۃً کنایۃً آپ ﷺ کے نبوت کے بعد بھی ان پڑھ رہنے کا ذکر نہیں بلکہ پڑھنے کا ذکر ہے۔ آپ ﷺ کے ان پڑھ ہونے کا ذکر نبوت ورسالت سے قبل کی قید کے ساتھ ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ نبوت کے بعد آپ لکھنے پڑھنے لگے تھے۔ اس قرآنی تصریح کے بعد بھی ایک جھوٹی حدیث پر ایمان رکھنا اور قرآنی آیات کی معنوی تحریف کرنا سخت افسوسناک ہے۔

تعلیم رسول ﷺ

حسب روایت صحیح بخاری وغیرہ حضور ﷺ پر سب سے پہلے جو قرآن مجید کی آیتیں اتریں وہ سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیتیں تھیں جن میں سے پہلی ہی آیت میں اقراء (پڑھو) کا حکم ہے۔ جس سے صاف ثابت ہو رہا ہے کہ حضور ﷺ کو پہلے پڑھنے کی صلاحیت عطا کر دی گئی۔ اس کے بعد پڑھنے کا حکم ہوا۔ اور ان پانچ میں سے تیسری آیت اور چوتھی آیت پڑھیے:

اقرا وربک الاکرم الذی علم بالقلم (سورۃ الاقراء:۳۔۴)

پڑھو تمہارا رب ساری بزرگیوں کا مالک ہے جس نے قلم کے ذریعے تعلیم فرمائی۔

اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ حضور ﷺ کو قلم کے ذریعے اسی جگہ قرآت کے ساتھ کتابت کی بھی تعلیم فرمائی گئی تھی اور عطائے منصب نبوت کے وقت آنحضرت ﷺ کو پڑھنے اور لکھنے دونوں کی تعلیم فرمائی گئی تھی۔ ان پانچوں آیتوں میں سے آخری یعنی پانچویں آیت ہے:

علم الانسان مالم یعلم (سورۃ الاقراء:۵)

اس انسان (کامل) کو ان (تمام باتوں کی جو منصب نبوت ورسالت وتبلیغ ارشاد کے لوازمات میں سے ہیں ان سب باتوں کی) جن کو وہ (کسی اور ذریعے سے) نہیں جان سکتے تھے تعلیم دی۔

اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم ہوئی تو یقیناً دوسرے معلموں سے بہتر تعلیم ہوئی اور حضور ﷺ ہر قاری سے بہتر قاری اور ہر کاتب سے بہتر کاتب معجزانہ طور سے دفعتاً ہو گئے۔

....

الرسول النبی الامی ﷺ

سید اختر عالم٭

یاایھا الذین امنو لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا واسمعوا
وللکٰفرین عذاب الیم۔ (القرآن۔۲:۱۰۴)

اے ایمان لانے والو! تم رسول ﷺ کو اپنی جانب مخاطب کرتے وقت لفظ "راعنا" سے مت خطاب کرو بلکہ "انظرنا" کے لفظ سے خطاب کیا کرو اور جی لگا کر ان کی باتیں سنا کرو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے حبیب ﷺ کی شان میں اتنی احتیاط ملحوظ خاطر ہے کہ وہ اس بات کو بھی گوارا نہیں فرماتا کہ آپ ﷺ کی شان میں کوئی ذومعنی لفظ اس طرح استعمال ہو کہ اس میں گستاخی کا شائبہ پایا جائے۔ لفظ راعنا کے معنوں میں دو پہلو مذمت اور گستاخی کے نکلتے ہیں یعنی ایک معنی "اے ہمارے چرواہے" اور دوسرا "اے ہمارے بد" کے نکلتا ہے اور ایک اچھا پہلو بمعنی "اے ہمارے سرپرست" کے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے لغت عربی کے ایک مستند اور عام فہم لفظ کو رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرنے کے لیے زبان عربی سے بالکل خارج الاستعمال ہونے کا حکم صادر فرما دیا۔

یہی وجہ ہے کہ 'باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار' کا مقولہ مسلمانوں میں قبولیت کا عام درجہ رکھتا ہے اور ہمارے نعت گو شعراء مدح وستائش میں بڑی احتیاط اور ذہنی ضبط و نظم کا اہتمام رکھتے ہیں ملاحظہ ہو عرفی کی تنبیہ:

٭ایف، ساؤتھ ۲۶/۳، بلیرٹ سیمی کالونی، جناح اسکوائر، کراچی

هشدار که نتواں بیک آہنگ سرودن

نعت شہ کونین و مدیح کے و جم را

خبردار! بادشاہ دو عالم کی شان میں نعت گوئی اور دنیاوی بادشاہوں کی مدح سرائی کے فرق سے غافل نہ ہونا۔

اللہ اکبر! احتیاط برتنے والے تو حضور اکرم ﷺ کی شان میں نعت و ثنا خوانی کے موقع پر اتنی محتاط روش کی پابندی لازم رکھیں تو پھر اس کے برعکس مواقع پر لاحق اندیشہ کے تحت ہمیں کس قدر احتیاط برتنی چاہیے۔

ان الرسول لسیف یستضاء به مهند من سیوف الهند مسلول

ہمارے رسول اللہ ﷺ ایک ایسی برہان قاطع تلوار کے مثل ہیں کہ جس سے ماحول میں اجالا ہی اجالا ہو جائے۔ آپ کی رفعت شان ہند (بلاد عرب کا ایک خطہ جو تلوار کی ساخت کے لیے مشہور ہے) کی جوہر دار تلواروں میں سے کھچی ہوئی ایک صیقل براں کے مثل ہے۔

حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب اپنے قصیدہ کا مذکورہ شعر پڑھا تو حضور اکرم ﷺ نے اصلاح فرمائی اور اسی دم "سیوف الهند" کی جگہ "سیوف الله" یعنی اللہ کی تلوار پڑھنے کو ارشاد فرمایا اور اس طرح آپ نے نعت گوئی میں محتاط روش اختیار کرنے کی نشان دہی فرما دی۔

یہاں بر سبیل تذکرہ اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا خود اپنی شان میں مدح و ستائش کے کلمات سننا اور شرف سماعت بخشنا" ورفعنا لك ذكرك "تیرے ذکر کو بلند و بالا کیا گیا) کے اعلان خداوندی کی تعبیر اور تحدیث سمجھ کر گویا استماع تشکر کی انجام دہی اور مومنوں کو صورت رسول ﷺ کی تہذیب و تربیت سے آراستہ کرتا تھا۔ اس لیے کہ انسانوں کی پیش کردہ مدح و ستائش کی کیا قیمت تھی، بمقابلہ ان ثنا خوانوں کے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کی شان میں یوں نازل فرمایا ہے:

۱۔ ان الله وملئکته یصلون علی النبی (القرآن:۵۶)

تحقیق کہ اللہ اور اس کے فرشتے اس نبی ﷺ پر درود بھیجتے رہتے ہیں۔

۲۔ وانک لعلی خلق عظیم (القرآن:۴)

اے میرے حبیب! تو ایک خلق عظیم پر فائز ہے۔

۳۔ وما ارسلنک الا رحمته للعالمین (القرآن:۱۰۷)

اے میرے حبیب! ہم نے تجھے تمام عالموں کے لیے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

۴۔ انا اعطینک الکوثر (القرآن:۱)

اے میرے حبیب! ہم نے تجھے خیر کثیر عطا کیا ہے۔

۵۔ لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمومنین روف رحیم۔ (القرآن:۱۲۸)

ہمارا رسول ﷺ تم ہی میں سے تمہارے پاس آ چکا ہے اس کی شفقت کا یہ عالم ہے کہ اسے تمہارا تکلیف اٹھانا شاق گزرتا ہے اسے تمہاری بہبود کا بڑا ہوکا لگا رہتا ہے اور مومنوں پر حد درجہ شفیق و مہربان ہے۔

۶۔ عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا (القرآن:۱۷:۷۹)

اے میرے حبیب! عنقریب تیرا رب تجھے مقام محمود پر فائز کرے گا۔

چنانچہ زیر نظر مضمون بھی ورفعنا لک ذکرک (تیرے ذکر کو رفعت بخشی گئی) کی تعبیر کی جانب ایک ادنیٰ کوشش ہے تاکہ لوگوں نے علم و تحقیق کے جو مغالطہ آمیز پردے بدر منیر ﷺ کی امیت (مرکزیت دوامی) پر ڈال دیئے ہیں انہیں دور کر دیا جائے۔ یہ نثر کی زبان میں نعت و مدح کی ایک صنف ہے جس کی تفہیم و تجزیے کے اجر میں انشاء اللہ تعالیٰ ہم آپ کے برابر کے حقدار ہیں۔ اس ذات اقدس کے دربار میں جو کریم بھی ہے اور روف رحیم بھی۔

الحمد للہ، یہ ایک ایسی اہم بالشان نعت گوئی ہے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے حضور فخریہ ادب کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں

اذا نحن اثنیا علیک بصالح فانت الذی نثنی وفوق الذی نثنی

جب ہم آپ کی ثنا خوانی میں کسی خوبی کو آپ سے منسوب کرتے ہیں۔ تو فی الحقیقت آپ کے صدق مجسم ہونے اور صدق و صفا کی منزل پر فائق ہونے کی مدح کرتے ہیں۔

چنانچہ مذکورہ بالا اہتمام اور تنبیہ کے باوجود اگر کوئی شخص حضور اکرم ﷺ کی شان میں بعض الفاظ قرآن کے ترجمے اس طرح کرے کہ اس لفظ کو وہ معنی قرار دے جس کے نتیجے میں وہ خلاف ادب الفاظ کے اظہار کی گرفت میں آئے تو پھر وہ یقیناً مذکورہ بالا خدائی انتباہ سے غفلت کا ثبوت دیتا ہے۔

لفظ "اُمی" کے معنی و مفہوم میں تواتر کے ساتھ لوگوں نے اپنی تحقیق و تعبیر میں جو سرسری رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ معیار حد ادب کے بالکل منافی ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ جو خداوند ذو معنی لفظ کے استعمال کو حضور ﷺ کے لیے استعمال کرنے کو منع فرما رہا ہے اور لفظ راعنا کا نعم البدل انظرنا عطا فرما رہا ہے وہی لفظ امی کو تین چار متبادل معنوں میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے خزانہ

قدرت میں اچھے اور مناسب حال الفاظ کی کچھ کمی نہیں تھی۔

پورے کلام مجید میں لفظ الامی دو جگہوں پر اور اس کی جمع الامیون چار جگہوں پر استعمال ہوئی ہے۔ ہمارے ترجمہ کرنے والوں نے جہاں حضور ﷺ کے لیے امی کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں کچھ اور ترجمہ کیا ہے اور جہاں اس کی جمع الامیون دوسرے لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے وہاں کچھ اور ترجمہ کیا ہے۔ یہ ذہنی ہچکچاہٹ اور تذبذب اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ وہ اس ترجمہ سے خود مطمئن نہیں اور تحت شعور میں پاس ادب کی کسک محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً سورۃ الاعراف میں دو جگہ اور یوں سمجھیں کہ پورے قرآن شریف میں حضور اکرم ﷺ کے لیے دو مرتبہ الامی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ہمارے مترجمین اس کا ترجمہ نہیں کرتے صرف نبی امی اور نبی امی نقل کرتے رہے ہیں (اس لیے کہ ان کے ذوق سلیم اور فطری جذبہ احترام کو اس بات سے ٹھیس لگتی ہے کہ وہ ان پڑھ بغیر لکھے پڑھے یا اس طرح کے کچھ اور لفظ ترجمہ میں لکھیں) لیکن دوسرے چار مقامات پر جہاں اس لفظ کی جمع امیون استعمال ہوئی ہے۔ وہاں وہ ترجموں میں "ان پڑھوں" اور جاہلوں کا لفظ استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہ حال تو اردو کے ترجموں کا ہے۔ انگریزی ترجموں میں جہاں حضور ﷺ کا ذکر آتا ہے تو وہاں پر اس کا ترجمہ (Unlettered) کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کے لیے (Illiterate) کرتے ہیں۔ یہاں بھی ایک ہی لفظ کے ترجمہ کے لیے دو الگ الگ انگریزی کے الفاظ کا انتخاب فرق مراتب قائم کرنے کے لیے کیا جاتا ہے جو مزید ثبوت اس بات کا ہے کہ مترجم خود ذہنی طور پر مطمئن نہیں ہے اور مجبوراً ادھر ادھر کے الفاظ تلاش کرتا ہے تاکہ حضور ﷺ کی شان کے شایان کوئی لفظ اسے کوئی مل جائے۔ مگر وہ کامیاب اس لیے نہیں ہیں کہ انہوں نے اس خدائی اہتمام کو پیش نظر نہیں رکھا کہ خدا تعالیٰ اپنے محبوب رسول ﷺ کے لیے عربی لغت کا کوئی ایسا لفظ استعمال کرنا پسند نہیں فرماتا، جو ذومعنی ہو اور اس کے حبیب ﷺ کی شان کے منافی ہو۔ نمونہ کے طور پر ایک مفسر قرآن کی تشریح بابت لفظ امی ملاحظہ ہو۔

''امی کے معنی مادر زاد کے ہیں اور ان پڑھ جاہل کو کہا کرتے ہیں یہ امر اگرچہ لوگوں کے واسطے عیب ہے۔ مگر حضرت رسول ﷺ کے واسطے ہنر تھا۔ کہ دوسرے لوگوں سے بغیر علم حاصل کیے، وحی، الہام اور علم لدنی کے ذریعہ علوم اولین و آخرین پر حاوی اور لکھنا پڑھنا سب کچھ جانتے تھے (تفسیر قرآن از مولانا سید فرمان علی صفحہ نمبر ۲۷۰۔ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ)''۔

اہل تدبیر کی واماندگیاں

آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

لیکن کیا وحی، الہام، علم لدنی اور علوم اولین و آخرین ایسے حقائق و علوم ہیں کہ ان کے فرمان کے بموجب دوسرے لوگوں سے حاصل کیے جا سکیں؟

مفسرین اور مترجمین کی یہ ساری ذہنی الجھنیں اور معکوس ذہنی ورزشیں رفع ہو جائیں اگر وہ اولا اللہ تعالیٰ کی مندرجہ ذیل تنبیہ سے سہو اتغافل اختیار نہ کرتے:

ولا تقف ما لیس لک به علم ان السمع والبصر والفؤاد کل

اولئک کان عنه مسئولا۔ (القرآن:۳۶)

جس چیز کی بابت تمہیں علم نہ ہو تم اس میں ظن اور قیافہ کی ٹانگ نہ اڑایا کرو۔ خبردار کہ تم اس بات کے لیے جواب دار بنائے گئے ہو کہ تم نے اپنی سمع، بصر اور فؤاد کی عطا کردہ صلاحیتوں سے کس طرح کام لیا۔

دوم یہ کہ اگر تصریف آیات (ان یزداد فیه ویحسن) یعنی لفظی اور معنوی لحاظ سے اضافہ اور حسن پیدا کیے جانے کی بابت اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں سات مقامات پر یعنی سورۃ الاسراء کی آیت نمبر ۴۱ اور ۸۹ میں سورۃ الکہف کی آیت نمبر ۵۴ میں سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۴۶، ۶۵، ۱۰۵ میں اور سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۵۸ میں جس اہمیت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اس کو ملحوظ خاطر رکھتے، یا پھر اصول تفسیر کے سلسلے میں خود اپنے اس قول کو سامنے رکھتے کہ فان القرآن یفسر بعضه بعضا (قرآن کی بعض آیات کی تفسیر بعض آیات خود کرتی ہیں) تو پھر انہیں اس علمی قباحت سے نجات مل جاتی۔ پورا قرآن شریف پڑھ جائیے۔ کہیں سے بھی اس بات کا کوئی شائبہ نہیں ملتا کہ حضور اکرم ﷺ کے تدریسی علم اور کتاب مخطوطی و ملفوظی کی اکتسابی تعلیم کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے کوئی موضوع بحث قائم کیا ہو اس پر کچھ کلام فرمایا ہو حضور اکرم ﷺ کے علم تدریسی و اکتسابی سے ناواقفیت کو وجہ افتخار ثابت کیا ہو یا خود اپنی ذات بابرکات کے لیے کوئی ستائش کا پہلو اس کی بابت ظاہر کیا ہو کہ حضور ﷺ کو تقدیر الٰہی کے تحت علم تدریسی سے محروم رکھا گیا تاکہ علم لدنی کے معجزات کا ظہور ذات اقدس ﷺ سے کرایا جائے۔

غالباً مفسرین کو سورۃ العنکبوت کی آیت نمبر ۴۸ سے یہ جواز فراہم کرنے کا مغالطہ ہوا ہے کہ وہ حضور ﷺ کی مروجہ علوم اکتسابی سے لاعلمی کو ایک مستقل موضوع بحث بنا کر پیش کریں۔ آیت مذکورہ یہ ہے:

وما کنت تتلوا من قبله من کتاب ولا تخطه بیمینک

اذا لا رتاب المبطلون۔ (القرآن:۴۸)

اے رسول ﷺ اس سے قبل نہ تو تم نے کسی کتاب کا مطالعہ اور اس کی عملی متابعت کی ہے اور نہ کسی تصنیف

وتالیف کے سلسلے میں مشغول رہے ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر یہ حق کو باطل قرار دینے والا گروہ اور بھی شک و

گمراہی میں مبتلا ہو جاتا۔

حالانکہ مذکورہ بالا آیت اس امر کو موضوع بحث نہیں بناتی کہ حضور ﷺ نوشت و خواند سے نا آشنا تھے۔ بلکہ یہ تو مخالفین کے ان الزامات کا جامع جواب تھا جو وہ قرآن کو مخفی بروحی اور منزل من اللہ نہ ماننے کی صورت میں کیا کرتے تھے مثلاً۔

وقالوا اساطیر الاولین اکتتبها فهی تملی علیه بکرة واصیلا۔ قل انزله الذی یعلم السر فی السموت والارض۔(القرآن:۵)

انہوں نے کہا کہ یہ اگلوں کے افسانے ہیں جن کو محمد ﷺ نے قلم بند کیا ہے اور یا صبح و شام انہیں املا (Dictation) کرا دیا جاتا ہے کہو کہ ایسا نہیں بلکہ اسے تو اس علیم ہستی نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے اسرار و رموز کو جانتا ہے۔

ولقد نعلم انهم یقولون انما یعلمه بشر۔ لسان الذی یلحدون الیه اعجمی وهذا لسان عربی مبین۔ (القرآن:۱۰۳)

اور ہمیں علم ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کو کوئی بشر (ذرہ برابر کوئی ثبوت، بعض عیسائی مصنفوں کے اس الزام کی حمایت میں نہیں ملتا کہ محمد ﷺ پر نازل شدہ وحی کے بیشتر حصے ایک عیسائی راہب کے مرہون منت ہیں یعنی اس کے تعلیم کردہ ہیں۔ Palmer, The Quran, Intr. Page XIVIII) قرآن تعلیم کر جایا کرتا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ جس شخص کی بابت تعریضیں پیش کر رہے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور قرآن کی زبان خالص اور صاف عربی ہے۔

ثم تولوا عنه وقالوا معلم مجنون ط(القرآن:۱۴)

پھر محمد ﷺ سے روگردانی کی اور کہنے لگے یہ تو کوئی سکھایا پڑھایا ہوا جنونی آدمی ہے۔

وقال الذین کفروا ان هذا الا افک ن افتراه و اعانه علیه قوم اخرون ۔ (القرآن:۴)

اور کافروں نے کہا محمد ﷺ پر نازل شدہ تعلیمات محض ایک من گھڑت باتیں ہیں۔ اس افترا میں کوئی گروہ ان کی در پردہ اعانت کر رہا ہے۔

حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ ایک طرف کفار و مشرکین کو یہ اصرار ہے کہ حضور ﷺ جو کچھ تعلیم دے رہے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ ان کی اکتسابی اور تحصیل کردہ علم کی بنا پر ہے بلکہ قرآن حضور اکرم ﷺ کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب ہے دوسری طرف اللہ تعالیٰ یہ تردید فرما رہا ہے کہ محمد ﷺ کی

دعوت کسی علمی سرقہ یا مخفی استادوں کے ذریعے سکھائے پڑھائے ہوئے علوم پر مبنی نہیں ہے بلکہ میری جانب سے ان کی شان مصطفائی و مجتبائی کے بموجب وحی کردہ اور الہامی ہے تیسری طرف ہمارے مفسرین نے حضور ﷺ کی نوشت و خواند کی بحث چھیڑ کر اپنی جانب سے ایک منفی اعزاز (Negative Honour) بے پڑھے لکھے ہونے کا بخشنا شروع کر دیا۔ معلوم نہیں وہ اتنی سی بات کیوں نہیں سمجھتے کہ مذکورہ بالا آیتوں میں مخالفین اسلام نے حضور ﷺ کی دعوت دین اور اس کے علمی ماخذ اور اساس پر اعتراضات وارد کیے ہیں نہ کہ صلاحیت نوشت و خواند کو موضوع بحث بنایا ہے۔

انہوں نے اس منفی اعزاز بخشی کے لیے صرف سورۃ العنکبوت کی مذکورہ آیت (نہ تو تم نے اس سے پہلے کسی کتاب کی پیروی کی اور نہ ہی تمہارے ہاتھ کسی تصنیف و تالیف میں مصروف تھے یا فن تحریر سے آشنا تھے) ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ تجاوز کی انتہا کر دی کہ اپنے اس وضاحتی موضوع کو جو کفریہ پروپیگنڈوں اور خدائی جوابات کے تقابل و تناظر میں مخفی درجہ رکھتا ہے اور تاویل احسن (حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے تاویل طلب مواقع سے نمٹنے کے لیے مومنین کو یہ خوش خبری دی ہے کہ وہ خود تاویل احسن فراہم کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے: ولا یاتونک بمثل الا جئنک بالحق و احسن تفسیرا (اور یہ مخالفین تمہارے پاس کوئی مثال لے کر نہیں آتے کہ ہم تمہیں حق اور اس کی احسن تفسیر عطا کر دیتے ہیں۔ (۲۵:۳۳)) کا محتاج ہے، مستحکم دلائل بخشنے کے لیے لفظ امی کو بھی "ان پڑھ اور جاہل" کا معنی دے کر اس کی شاندار معنویت کو پامال کرنا شروع کر دیا۔

واضح ہو کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو لفظ "مجید" کی صفت سے شرف بخشا ہے اور اس کے معنی بزرگ و با مرتبہ (مجید) اس مفہوم میں ہے کہ یہ کتاب صحت لفظی، ترکیبی اور معنوی میں یکتا ہے اور بلاغت آفرینی میں اس درجہ کمال کی حامل ہے کہ اس کی صداقت، بابت اس کے دعویٰ کے تبیانا لکل شئی (ہر شے کے لیے واضح بیان) کسی خارجی عوامل کی محتاج نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی لغت میں اس اونٹ کی بابت جو شکم سیر ہو کر کسی قسم کی طلب و احتیاج سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے:

مجدت الابل

اونٹ سرسبز چراگاہ میں خوب شکم سیر ہو گیا۔

چنانچہ قرآن اپنی بلاغت اور شان استغناء کا ایک اولی بنیادی ثبوت یہ بھی پیش کرتا ہے کہ جس کسی مقام پر کسی مفہوم کی ادائیگی کے لیے لغت عربی میں کئی ایک متبادل الفاظ ملتے ہیں وہاں وہ اسی لفظ کا انتخاب کرتا ہے جو منفی، ذو معنویت سے پاک ہو اور مثبت ذو معنویت اور بلاغت کا حامل ہو۔ اس حقیقت کو

اگر پیش نظر رکھا جائے تو ہمیں ولا تخطہ بیمینک (۲۹:۴۸) والی آیت میں یہ معنی نکالنے سے کہ حضور ﷺ کے دست مبارک نوشت وتحریر سے نابلد تھے، اجتناب برتنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا محض یہ فرمانا کہ اے محمد ﷺ اس سے قبل تم کسی تصنیف وتالیف میں مشغول نہیں رہے، اس مفہوم کو کب لازم قرار دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کی اس صلاحیت کی حتمی نفی فرما رہا ہے۔ آپ کی صلاحیت نوشت وتحریر کی بابت جہاں قرآن خاموش ہو، نہ تو نفی کرتا ہو اور نہ اثبات، وہاں ہماری جانب سے صراحتاً نفی کرنا بڑی جسارت کی بات ہے۔

اگر لفظ تخط اور یمین کی معنوی گہرائیوں پر نظر ڈالی جائے تو یہ بجائے نقص وکمی کے وصف وایجاب کا مفہوم عطا کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں اس کے لغوی معنی اور شوکت مفہوم:

خط الخطة لنفسه . اتخذها واعلم عليها

کسی خطہ زمین پر قابض ہونا اور اس پر اپنا جھنڈا گاڑنا

خط الرياح الرمل. جعلت فيه طرائق مستطيلة

تندوتیز ہوا کا ریت کے ٹیلوں میں سے مستطیل راستے نکال دینا۔

فلان يخط في الارض . يفكر في امره

کسی شخص کا اپنے مسائل پر غور وفکر کرنا

خط البلاد . جعل لها حدودا

ملک کی سرحد بندی کرنا، حدود متعین کرنا

اب یمین (داہنا ہاتھ) کی معنویت ملاحظہ ہو

یمین ۔ برکت، قوت، قدرت

يمن الله فلانا . جعله مباركا

فلاں شخص کو اللہ نے مبارک بنایا

يمن لقومه على قومه. كان مباركا عليهم

اپنی قوم کے لیے مبارک ثابت ہوا۔

قرآن شریف نے بھی لفظ یمین کو قدرت، طاقت، شان اور رعب ودبدبے کے مفہوم میں، ان آیتوں میں استعمال کیا ہے۔

فراغ عليهم بضرب اليمين ۔(۹۳:۳۷)

پھر ابراہیم علیہ السلام جھکے بتوں پر اور زوردار ضرب (ہاتھ) لگانے کے لیے

قالوا انكم كنتم تاتوننا عن اليمين (القرآن:۲۸)

جزا مزا والے دن نیکوکار کہیں گے بدکاروں سے اچھا آپ وہی ہیں جو ہم سے دنیا میں بڑی شان وشوکت اور رعب ودبدبے سے پیش آیا کرتے تھے۔

لکھنے لکھانے کے مفہوم کی ادائیگی کے لیے زبان عربی میں کتب، سطر اور رسم بھی آتا ہے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی شان میں مذکورہ کوئی لفظ استعمال نہیں فرمایا اور ایک مقام پر تخط کہہ کر حضور ﷺ کے لکھنے لکھانے کا تذکرہ بھی فرمایا تو لفظ کو ایک ایسی شان امتیازی بخشی کہ پورے قرآن میں دوسری مرتبہ اس لفظ کا استعمال قطعاً نہیں ہوا۔ بات واضح ہے اور اس کی تشریح کو آپ نے ان دونوں لفظوں خط اور یمین کے مذکورہ بالا پر شوکت معنی اور لغوی معنویت میں خود ملاحظہ فرمالیا۔ یعنی یہ کہ فلان یخط فی الارض کے معنی فلان یفکر فی امرہ (فلاں شخص اپنے مسائل پر غور وفکر کرتا ہے اور ذہنی کاوشوں سے کام لیتا ہے) کی مثال لغت عربی سے گزشتہ سطور میں پیش کی گئی، اس کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کرلیں کہ کیا حضور ﷺ دعوت دین کے سلسلے میں جن دشواریوں اور صعوبتوں سے گزر رہے تھے اور کی دور کے جن مسائل سے دوچار تھے خواہ وہ دور ابتدائی دنوں میں پوشیدہ اور خفیہ دعوت دین کا ہو یا اعلانیہ دعوت دین کے آغاز کا ہو یا ظہور نبوت سے پہلے غار حرا اور دوسرے غاروں میں جا جا کر اعتکاف اور مراقبہ ومکاشفہ کا دور ہو کیا ان تمام احوال وایام کے دوران میں حضور اکرم ﷺ فکری کاوشوں اور شدید قلبی بے چینیوں کی کیفیت سے نہیں گزر رہے تھے؟ اگر گزر رہے تھے تو آپ اپنی فکری کاوشوں کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرسکتے تھے یا کرا سکتے تھے اور اسے بھی تحریری صحیفہ اور افکار نوشتہ کی صورت میں مخاطبین کے سامنے پیش کرسکتے تھے لیکن آپ نے باوجود شدید فکری اضطراب اور قلبی رنج وکوفت کے ایسا نہیں کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اسی طرف اشارہ فرما رہا ہے کہ اے میرے حبیب اگر تیرے دست مبارک نے اگر تیری فکری کاوشوں کو تحریری صحیفہ کی صورت میں پیش کیا ہوتا تو یہ لوگ اور بھی شک وشبہ میں گرفتار ہو جاتے۔

اگر کسی صاحب کو یہ گمان ہو کہ پہلی وحی نازل ہونے سے قبل حضور ﷺ کا حساس قلب اپنے ماحول سے غیر متعلق تھا اور آپ ﷺ چین اور پرسکون کی زندگی گزار رہے تھے تو وہ بڑی بھول میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو حضور ﷺ کی اس قلبی بے چینی کا کیسا علم تھا ۔۔۔۔ مندرجہ ذیل آیتوں کے پیار بھرے کلمات اس کی گواہی خود پیش کر رہے ہیں۔

الم نشرح لک صدرک ووضعنا عنک وزرک الذی انقض ظہرک (۱:۹۴)

کیا ہم نے تمہارا سینہ کشادہ نہیں کر دیا اور تم پر سے وہ بوجھ نہیں اتار دیا جس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی۔

لعلک باخع نفسک الا یکونو مومنین (۳:۲۶)

شاید تم مارے افسوس کے اپنی جان دے ڈالو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔

فلعلک باخع نفسک علی آثار ھم ان لم یومنو بھذا الحدیث اسفا (۶:۱۸)

اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو شاید تم مارے افسوس کے ان کے پیچھے اپنی جان دے ڈالو گے۔

چنانچہ خط اور یمین کی جو لغوی تشریحات اس سے پہلے پیش کی گئیں ان کی روشنی میں ہم وما کنت تتلو من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون (۴۸:۲۹) والی آیت کے فقرہ ولا تخطہ بیمینک کا متبادل ترجمان متبادل الفاظ میں کر سکتے ہیں:

۱۔ اور نہ تو اپنے فکری مسائل کی عقدہ کشائی میں تیرے دست قدرت نے کسی تحریری کاوش سے کام لیا۔

۲۔ اور نہ تو تیرے دست قدرت نے تیری فکری کاوشوں کا کوئی صحیفہ تحریر پیش کیا۔

۳۔ اور نہ تو تیرے دست قدرت نے تیرے فکری تعمق کا کوئی نوشتہ پیش کیا۔

واضح ہو کہ کلام مجید کتاب کے استعمال کے ساتھ کسی کتاب کی کتابت کا مفہوم ادا کرنے کے لیے ہمیشہ خط کی جگہ کتب کا لفظ استعمال کرتا ہے اور کتب کے سلسلے میں کتابت کرنے والے ہاتھ کے لیے یمین کی جگہ (ید کی جمع بمعنی ہاتھ) کا لفظ استعمال کرتا ہے:

من عند اللہ (القرآن ۲:۷۹)

یہود اور نصاریٰ اپنے ہاتھوں (اید) سے کتاب کی کتابت کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔

چنانچہ حضور اکرم ﷺ کی صلاحیت کتابت اور نوشت و تحریر کی بابت ہے اس مفہوم کی ادائگی کے لیے جسے ہمارے مفسرین اور مترجمین تواتر کے ساتھ پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ قرآن شریف کی عبارت شاید یوں ہوتی:

ولا تکتبہ بیدک

لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کلام مجید نے اپنے مفہوم کی ادائگی کے لیے اور حضور اکرم ﷺ سے مخاطب ہوتے ہوئے لفظ تکتبہ اور ید کو ترک کر کے لفظ تخطہ اور یمین انتخاب فرمایا اور اس بلیغ و عظیم مفہوم کو حد درجہ وقیع اور مہتم بالشان بنائے رکھنے کے لیے پورے کلام مجید میں کسی اور موقع پر یا کسی

اور فرد و بشر یا نبی کے لیے استعمال نہیں فرمایا۔

چنانچہ مذکورہ بالا آیت (۴۸:۲۹) جن مخالفین حق کو پیش نظر رکھ کر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ان کا مجرمانہ ضمیر اس کا براہ راست مفہوم سمجھ رہا تھا۔ اس لیے کہ یہ ان ہی کی شان میں ایک چیلنج تھی۔

واضح ہو کہ تلبیس آمیز یہودیت اور تحریف شدہ عیسائیت کے علم برداروں کا یہ خاصہ تھا کہ الہامی کتابوں کی متابعت کے جھوٹے دعووں کے ساتھ اپنی طرف سے تصنیف و تالیف کے انبار لگاتے چلے جا رہے تھے اور اس جرم کا الزام اپنے آئینہ کردار کی روشنی میں الٹا حضور ﷺ پر عائد کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ کی اس اجتماعی بدکرداری (انجیل کی تحریف کس وسیع پیمانے پر کی گئی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ڈاکٹر مل (Dr. Mill) کی تحقیق کے مطابق اس کے تیس ہزار نسخے اور ڈاکٹر گریسباخ (Dr. Griesbach) جنہوں نے اپنی عمر کے تیس سال اس تحقیق میں صرف کیے ان کے حساب سے انجیل کے تین لاکھ نسخے ایسے ہیں جو باہم متضاد اور مختلف ہیں۔ ملاحظہ ہو پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی کتاب۔ (What is Christianity) صفحہ نمبر ۔۵۱)) کی روشنی میں خدائے علیم و خبیر نے اس آیت کے ذریعہ یہ بتایا کہ تمہاری طرح نہ تو محمد ﷺ کسی سابقہ کتاب آسمانی کی متابعت کے دعویدار تھے اور نہ ہی اس دعویٰ کو بنیاد بنا کر اپنی جانب سے علمی سرقہ یا تحریف و تلبیس (نعوذ باللہ) کے ذریعہ کسی تصنیف و تالیف کی قدرت و مہارت پیش کر رہے ہیں۔ اگر محمد ﷺ ایسا کرتے، تو تم حق کو باطل اور باطل کو حق بنانے کے فن میں ماہر ہو اور جس کا فرد مشرک قوم میں بھی اپنی دعوت پیش کرنے گئے ان ہی کی ضلالتوں اور گمراہیوں کا لبادہ اوڑھ کر اشتراک عمل میں مصروف ہو گئے تو پھر محمد ﷺ پر نازل کردہ حقیقت الحقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہتے اور انہیں بھی اپنے ہی جیسا سمجھ بیٹھتے۔

اتنی عظیم تنقیدی معنویت کو چھوڑ کر ہم نے یہ سطحی معنی وضع کر لیے کہ حضور ﷺ کے دست مبارک نوشت و تحریر سے عاری تھے (اور اللہ تعالیٰ اس آیت میں ہمیں خاص طور پر اسی بات سے آگاہ کرنا چاہتا ہے) ایسی بے محل بات جس کا نفس مضمون اور موضوع بحث سے کوئی ربط نہ ہو فکری الجھاؤ کے مریض ہی کر سکتے ہیں۔

لفظ امی کے لغوی و اصطلاحی معنوں اور قرآنی آیات پر مبنی دلائل کی تفصیلات میں جانے سے پہلے ذرا اس پہلو پر غور فرمائیں کہ کیا کوئی خالق اپنی مخلوقات کی جبلی اور فطری صلاحیتوں کی بابت جو اس نے اس کی سرشت اور بنیاد تعمیر میں ہی ودیعت کر دی ہیں کبھی اس قسم کا تذکرہ کرنا مناسب سمجھے گا کہ اس کی قوت صناعی اور تخلیقی پر حرف آئے۔ مثلاً کیا کوئی طیارہ سازی کا انجینئر یہ مضحکہ خیز بات زبان پر لائے گا کہ

دیکھو میرے طیارے کی اڑان، حالانکہ اس نے کسی پرندے سے پرواز کی تعلیم حاصل نہیں کی۔ اسی طرح کیا کمپیوٹر مشین کا موجد ایسی مضحکہ خیز بات کرسکتا ہے کہ دیکھو اس مشین نے نہ تو کسی سے گنتی اور پہاڑا سیکھا، نہ جمع تفریق اور ضرب تقسیم سیکھی، لیکن یہ بڑے سے بڑے تجارتی ادارے کا بجٹ اور اکاؤنٹ تک آڈٹ کرلیتا ہے کیا آج تک کسی عاقل انسان نے بطخ کے نوزائیدہ بچے کو پانی میں داخل ہوتے ہی تیرتا دیکھ کر بھی یہ سوال بھی کیا کہ اس بچے نے انڈے سے نکلتے ہی تیرنا کس طرح سیکھ لیا؟ اگر نہیں تو پھر حضور ﷺ کی مخلوقی اور مکتوبی علم سے یقین کردہ نا آشنائی کو موضوع بحث بنانا کس درجہ مضحکہ خیز ہے۔ وہ ذات اقدس جو سراپا علم ہی علم ہے اور بعد خدا مبداء و منتہا ہے تمام علوم کا اس ذات پاک ﷺ کی بابت یہ موضوعات قائم کرنا در اصل حقیقت وجود محمد ﷺ سے بے خبری یا اعراض ہی ہوسکتا ہے۔

حالانکہ ہمارے مفسرین اس حقیقت سے ناواقف نہیں کہ اللہ تعالیٰ اور محمد ﷺ کے درمیان تعلیم قرآن مجموعی کے سلسلے میں کوئی درمیانی واسطہ نہیں ہے۔ خود اللہ ہی نے پورا کا پورا قرآن جو تمام علوم جزئی وکلی پر محیط ہے اور کوئی رطب و یابس اس کے احاطۂ علمی سے باہر نہیں۔ محمد ﷺ کو بہت پہلے اس سے کہ انسان کو خلق کیا اور اسے علم بیان تعلیم کیا فطرۃً تمام علوم جزوی وکلی ودیعت کردیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بمقتضائے سرشت محمدی ﷺ، بربنائے صفات تجبائی و مصطفائی حقیقت وجود محمد ﷺ کو معلم پہ قرآن مجموعی وکلی اسی لمحہ کردیا تھا جسے عارفان حق نزول اول از مقام احدیت سے تعبیر فرماتے ہیں۔

واضح ہو کہ تعلیم قرآن اور تنزیل قرآن میں فرق تمیزی لازم ہے ورنہ یہ نکتہ ناقابل فہم ہی رہے گا۔ تعلیم قرآن آناً فاناً اور جملۃً طور پر قلب محمد ﷺ اور وجود محمد ﷺ پر ہوئی اور تنزیل قرآن بواسطہ جبریل امین نجماً نجماً اور وقتاً فوقتاً حالات نزول کے تحت ہوتی رہی، یہ مذکورہ حقائق مندرجہ ذیل آیات قرآنی اور حدیث میں مضمر ہیں:

۱۔ الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمه البیان۔(۵۵:۱)

الرحمٰن نے پورے کا پورا قرآن تعلیم فرمایا۔ پھر انسانوں کو خلق کیا اور پھر اسے بیان و توضیح کی تعلیم وصلاحیت ودیعت کی۔

۲۔ فانه نزله علی قلبک باذن اللہ(۲:۹۷)

بے شک جبریل امین نے اذن الٰہی سے تیرے قلب پر وقتاً فوقتاً قرآن کی تنزیل کی۔

۳۔ ان علینا جمعه و قرانه فاذا قرأنا فاتبع قرانه ثم علینا بیانه۔(۷۵:۱۷)

یقیناً جس طرح پورے کا پورا قرآن جمع کردینا ہمارے ذمہ ہے اسی طرح اس کا پڑھوا دینا بھی تو پھر ہم

جبریل امین کی زبانی جتنا کچھ سنا دیں، تم بھی اتنا ہی لوگوں کو سنا دو، پھر تمہارے لیے ان کے مطالب کی وضاحت بھی میرے ہی ذمہ ہے۔

۴۔ کنت نبیا و آدم بین الماء والطین (الحدیث)

میں اس وقت بھی مقام نبوت پر فائز تھا جب کہ آدم ابھی آب و گل کے تخلیقی مراحل سے گزر رہے تھے۔

حقیقت وجود محمد ﷺ سے متعلق مندرجہ بالا اشارات کچھ وضاحت طلب ہیں چنانچہ واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ علیم بالذات ہے اور علیم بالذات جاہل لذات کو محبوب نہیں رکھتا۔ کامل کمال کو اور جمیل جمال کو پسند کرتا ہے، اللہ جمیل و یحب الجمال (اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے) لہٰذا اس نے نبیوں کو نہ صرف یہ کہ غیر عالم اور جاہل پیدا نہیں کیا بلکہ علم ان کی سرشت میں ودیعت کیا اور اول چیز جو صفات الٰہیہ میں سے مقام احدیت سے متنزل ہوئی ہے وہ علم ہی ہے۔

الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمه البیان ط

الرحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔ انسان کو خلق کیا اور اس کو بیان سکھایا۔

اس آیت میں تعلیم قرآن کا ذکر مقدم ہے، انسان کی تخلیق پر۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے الرحمٰن فرمایا ہے ''اللہ'' نہیں فرمایا ہے اور خلقت انسان سے پہلے تعلیم قرآن کا ذکر کیا ہے تو پھر وہ تعلیم حاصل کرنے والا معلم کون ہے جس کو خلقت انسانی کی تخلیق سے پہلے ہی القرآن (پورے کا پورا قرآن) تعلیم کردیا گیا تھا؟

اللہ اسم باری تعالیٰ ہے باعتبار جامع ہونے جملہ صفات کمالیہ کے ''الرحمٰن'' اسم ہے باعتبار ظہور ان جملہ صفات کمالیہ کے جو اسم اللہ میں مضمر ہیں کیونکہ رحمت ہی سے ظہور ہوتا ہے۔

ورحمتی وسعت کل شی۔(الاعراف:۱۵۶)

ہماری رحمت ہر شے پر وسیع اور محیط ہے

اور تعلیم مقام ظہور ہے اس لیے الرحمٰن فرمایا، اللہ نہیں اسی لیے جہاں کہیں کلام مجید میں صفات علم الٰہی کا ذکر آتا ہے وہاں الرحمٰن اور رحمت ہی استعمال ہوتا ہے مثلاً عالم الغیب والشهادة هو الرحمن الرحیم(۵۹:۲۲)اور ربنا وسعت کل شی رحمته و علما(۴۰:۷)

چنانچہ وہ معلم جسے قبل انسانی القرآن کی تعلیم کلی دی گئی وہ حقیقت نورانیہ محمد ﷺ ہی ہے کیونکہ آپ اول موجودات ہیں۔ بموجب اس حدیث کے اول ما خلق اللہ نوری (سب سے پہلے جو چیز اللہ نے خلق کی وہ میرا نور ہے) اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ اول اول جو چیز مقام احدیت سے

منزل ہوئی وہ علم ہے۔ لہٰذا حقیقت نورانیہ محمدیہ فی نفسہٖ حقیقت علمیہ ہے۔ یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ یہ تعلیم القرآن زمان و مکان کے لحاظ سے تعلیم عالم عنصری و ارضی نہیں ہے بلکہ تعلیم ایجادی ہے۔

یعنی مبدء فیاض باری تعالیٰ نے اول اول قوت علمیہ ایجادی کی جو حقیقت نورانیہ محمدیہ ﷺ ہے۔

اس حقیقت کا ثبوت کہ انبیاء کرام کی تعلیم تعلیم ایجادی ہے اور ایجاد و تعلیم دونوں ایک ہی آن واحد میں ہیں اور یہ کہ ان کی تعلیم، تعلیم تدریجی یا اکتسابی نہیں، قصہ آدم کے اس جز میں واضح طور پر درج ہے۔

۱۔ واذا سویتہ و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ سجدین ۔ (۲۹:۱۵)

جب میں آدم علیہ السلام کے پتلے کو درست اور معتدل بنالوں اور اپنی روح خاص اس میں پھونک دوں تو تم سارے فرشتے اس کے آگے سجدہ ریز ہو جاؤ۔

۲۔ وعلم آدم الاسماء کلھا (۳۱:۲)

اور پھر آدم علیہ السلام کو اللہ نے تمام اسماء کی حقیقت تعلیم کر دی۔

چنانچہ یہ تعلیم حضرت آدم علیہ السلام محض نفخ روح ہی سے ہوا نہ یہ کہ پہلے ان کو خلق کیا گیا پھر روح پھونکی گئی اور اس کے بعد درجہ بدرجہ ان کو تعلیم دی گئی۔ بلکہ ایجاد آدم، نفخ روح اور تعلیم بیک وقت اور ایک ہی آن واحد میں ہوئی یعنی ان کو عالم پیدا کیا گیا اور وہ اپنی سرشت وجود میں ہی علم و یقین سے نوازے گئے اور وہ روح تھی، روح علمی ہے جو ان کو دی گئی اور جس کے داخل ہوتے ہی وہ عالم ہو گئے۔

دوسرا ثبوت میثاق ارواح کے واقعہ میں ملتا ہے۔ جب عالم ارواح کے تمام نفوس سے اللہ تعالیٰ نے سوال کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ تو سب روحوں نے بیک آواز جواب دیا، ہاں کیوں نہیں (واشھدھم علی انفسھم قال الست بربکم قالو بلی ۔ (۱۷۲:۷) ظاہر ہے کہ جب تک عرفان حق ان روحوں کے وجود و سرشت میں اور ان کی فطرت و جبلت میں اللہ تعالیٰ نے تعلیم نہیں کی تھی ان کا جواب اثبات میں دینا اور اپنے نفسوں کو خود پر گواہ بنانا محال عقلی تھی۔

تیسری مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس حالت طفولیت کی ہے کہ جب وہ آغوش مادر میں تھے اور گہوارہ کی زینت تھے اسی وقت وہ لوگوں سے سوال و جواب میں پورے علم اور وثوق کے ساتھ مشغول تھے۔

فاشارت الیہ قالو کیف نکلم من کان فی المھد صبیا قال انی عبد اللہ اتنی الکتاب وجعلنی نبیاً و جعلنی مبارکا این ما کنت و او صانی بالصلوۃ والزکوۃ ما دمت حیاً

وبرا بوالدتی ولم یجعلنی جبارا شقیا والسلام علی یوم ولدت و یوم اموت و یوم ابعث حیا۔ (۱۹:۲۹تا۳۳)

تو مریم نے اپنے شیر خوار بچے کی طرف اشارہ کیا اس پر وہ لوگ بولے کہ بھلا ہم لوگ گود کے بچے سے کس طرح گفتگو کریں۔ جب عیسیٰ علیہ السلام بول پڑے، بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں، اسی نے مجھ کو کتاب عطا کی، مجھ کو نبی بنایا اور جہاں بھی میں رہوں مجھ کو مبارک بنایا اور جب تک میں زندہ ہوں مجھ کو نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی ہے اور مجھے اپنی والدی کا فرمان بردار بنایا اور مجھے سرکش و نافرمان نہیں بنایا اور جس دن مجھے پیدا کیا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن دوبارہ زندہ کھڑا کیا جاؤں گا۔ خدا کی طرف سے مجھ پر سلام ہی سلام ہے۔

مذکورہ بالا آیات و تشریحات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ جو شے مصدر علم یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانی سے ظہور پذیر ہوئی وہ حقیقت نورانیہ علمیہ محمدیہ ﷺ ہے جو کل موجودات روحانی و نفسانی، نورانی و ظلماتی اور علوی و سفلی کے احوال، ان کی کیفیات و کیات اور حقائق و دقائق پر حاوی ہے۔ ﷺ لہٰذا ایسی ذات بابرکات کے سلسلہ میں علم و جہل اور خواندگی و ناخواندگی کے موضوعات قائم کرنا اور بے سوچے سمجھے لفظ "الامی" کو بھی جو اپنے اندر معنویت کا ایک عظیم اور باشان عالم سموئے ہوئے ہے، پڑھے اور ان پڑھے کی بحث میں ملوث کرنا ظلم صریح ہے۔

(یہ مضمون سید اختر عالم صاحب کی کتاب 'حقیقت محمدیہ ﷺ' سے ماخوذ ہے۔)

....

حجِ اکبر کا معنی و مفہوم

ڈاکٹر محمد شکیل اوج
استاذ شعبہ علوم اسلامی جامعہ کراچی

واذان من اللہ ورسولہ الی الناس یوم الحج الاکبر ان اللہ بری من المشرکین ورسولہ۔ (التوبہ ۳)

اللہ اور اسکے رسول کی جانب سے تمام لوگوں کی طرف حج اکبر کے دن اعلان (عام) ہے کہ اللہ مشرکوں سے بیزار ہے اور اسکا رسول بھی (ان کے عہد و پیمان سے بری الذمہ ہے)

قرآن مجید کا یہ واحد مقام ہے کہ جہاں حج کے لیے حج اکبر کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ آیت مذکورہ مسلمانوں کے جس عظیم اجتماع میں پہلی مرتبہ پڑھ کر سنائی گئی وہ سن ۹ ہجری میں ادا ہونے والے پہلے حج کا عظیم الشان اجتماع تھا۔ جو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امارت میں ہوا تھا۔ اس لیئے ظاہر ہے کہ قرآن کی رو سے اصلاً حج الاکبر کے الفاظ اسی محل کے لیئے مخصوص و مفہوم ہوئے۔ مطلب صاف ہے کہ حج اکبر کی تخصیص و تفہیم کا انحصار جس محل پر موقوف ہوا۔ وہ یہی تھا۔ کیونکہ حج اکبر کا مورد اصلی بھی یہی حج تھا۔

پھر یہ حج نہ تو جمعہ کو واقع ہوا اور نہ ہی نو یا دس ذوالحجہ کو۔ بلکہ یہ اصلاً دس ذوالقعدہ کو واقع ہوا۔ جسے نسی کے قاعدہ سے ذوالحجہ بنایا گیا تھا۔ عربوں میں قمری کیلنڈر کو آگے پیچھے کرنے کی رسم بد موجود تھی۔ یوں مکہ میں بیک وقت دو کیلنڈر جاری رہتے تھے ایک اصلی (یعنی قمری) اور دوسرا مصنوعی (یعنی نسی) تو نسی کیلنڈر کے حساب سے ۹ ہجری کا حج ۱۰ ذوالحجہ کو ہوا تھا۔ مگر قمری حساب سے وہ ۱۰ ذوالقعدہ میں واقع ہوا

تھا۔ (۱) اس لیئے جب ۱۰ ذوالحجہ ۱۰ ہجری کو رسول اللہ ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع ارشاد فرمایا تو آپ نے اس امر کا اعلان بھی کیا کہ ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق السموٰت والارض السنۃ اثنا عشر شھراً منھا اربعۃ حرم ثلٰث متوالیات ذوالقعدہ وذوالحجہ والمحرم و رجب مضر الذی بین جمادی الاخریٰ وشعبان۔ (۲)

زمانہ اپنی اصل ہیئت میں گھوم کر آچکا ہے۔ جس ہیئت پر وہ اس دن تھا، جب اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا تھا، سال بارہ مہینے کا ہے۔ جن میں سے چار حرمت والے ہیں تین متواتر ہیں یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم الحرام۔ چوتھا رجب ہے جو مضر قبیلے کا کہلاتا ہے اور یہ جمادی الاخریٰ اور شعبان کے مابین ہے۔

ہمارے ہاں حج اکبر کے سلسلے میں بالعموم جو بحث ملتی ہے وہ اپنے بنیادی مقدمے کے اعتبار سے ہی غلط ٹھہرتی ہے۔ جب یہ امر تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حج اکبر کا تعلق اصلاً ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امارت والے حج سے ہے تو پھر آپ ﷺ رسول اللہ ﷺ اور جمعہ کو زیر بحث لانا امر زائد ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ جو حج، جمعہ کو ہوتا ہے۔ اسے حج اکبر کہتے ہیں، غلط ہے یا وہ حج جو رسول اللہ ﷺ نے ادا کیا۔ وہ آپ کی وجہ سے حج اکبر ہوا۔ یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ قرآن مجید نے اسلام کے پہلے حج کو حج اکبر کہا ہے۔ جس میں یہ دونوں باتیں نہیں پائی جاتیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حج اکبر کا تعین یقینی طور پر ان ہر دو امور سے ہٹ کر ہے۔

ہمارے نزدیک حج اکبر سے کوئی مخصوص قسم کا حج مراد نہیں ہے بلکہ یہ ہر سال وقوع پذیر ہونے والے حج کا ہی نام ہے۔ اکبر کا لفظ تو حج اصغر یعنی عمرہ سے تقابل و امتیاز پیدا کرنے کے لیئے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ تفسیر کبیر میں ہے ھذا ھو الحج الاکبر لان العمرۃ تسمی الحج الاصغر، اور تفسیر روح المعانی نے اسی حقیقت کو بایں الفاظ ادا کیا ہے۔ ووصف بالحج بالاکبر لان العمرۃ تسمی الحج الاصغر۔ (۳)

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جس وقت یوم الحج الاکبر والی آیت نازل ہوئی تھی تو کیا اس وقت سے ہی اس کا مفہوم یوم العرفہ یا یوم النحر یا یوم الجمعہ کے ساتھ بریکٹ ہو گیا تھا؟ ہرگز نہیں۔ یہ اضافی بحثیں یقیناً بعد میں پیدا ہوئیں کیونکہ یہ آیت اپنے وقت نزول سے ہی اپنی جو ہریت میں جس مفہوم کی حامل تھی۔ وہ فقط اتنی تھی کہ (چونکہ) مسلمانوں نے اب تک صرف عمرے ادا کیئے تھے۔ جسے وہ حج اصغر سے تعبیر کرتے تھے اور اب یہ پہلا موقع تھا کہ جس میں مسلمانوں کو حکم فرضیت کے بعد حج کی سعادت نصیب ہونے والی تھی۔ چنانچہ اسے حج اصغر سے ممتاز اور نمایاں کرنے کے لیئے حج اکبر کہا گیا۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ حج الاکبر سے پہلے جو لفظ یوم آیا ہے اس سے مراد کوئی خاص دن لیئے

پر جو اصرار کیا جاتا ہے۔ اسکی وجہ لفظ یوم کی عدم معرفت ہے۔ یوم کا لفظ عام طور پر عربوں کے ہاں مطلق وقت اور زمانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ جو دن اور رات کی تحدید و تخصیص سے بالعموم آزاد ہوتا ہے۔ اس لیے گردش لیل و نہار کو یوم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اس تعریف کی رو سے یوم کا اطلاق جہاں کسی ایک دن پر کیا جاتا ہے وہیں ایک سال، ایک سو سال، ایک ہزار سال بلکہ پچاس ہزار سال پر بھی کیا جاتا ہے۔

تعرج الملئکة والروح الیه فی یوم کان مقدار خمسین الف سنه (المعارج/۴)

اسکی طرف فرشتے اور روح الامین عروج کرتے ہیں، ایک یوم میں جس کا اندازہ پچاس ہزار برس کا ہے۔

اور یوم کا لفظ بطور استعارہ کسی امر عظیم کے لیے بھی بولا جاتا ہے اور اسکے معنی حکومت و سلطنت کے بھی آتے ہیں۔

واضح رہے کہ قرآن مجید میں یوم کا لفظ ۳۴۹ مرتبہ آیا ہے۔ اور ہر جگہ اس کے معنی، اس دن کے نہیں ہیں جو چوبیس گھنٹوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بلکہ یہ لفظ جہاں کسی مخصوص وقت و حالت کے لیے بولا جاتا ہے وہیں کسی خاص دور اور مرحلہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

آیت زیر بحث میں یوم کا لفظ جس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ہمارے خیال میں اسے یوم العرفہ یا یوم النحر کی کسی ایک اکائی میں محصور کر کے جمعہ کی شرط سے مشروط کرنا، اسکی وسعتوں کی محدود کرنا ہے۔ ہمارے نزدیک یوم الحج الاکبر سے مراد اسلام کے اولین حج سے لیکر قیامت تک واقع ہونے والے تمام حجوں کا زمانہ ہے جسمیں اس اعلان کی تذکیر کا عملی سامان اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے جسمیں فرمایا گیا تھا کہ اب وہ وقت آگیا ہے یعنی حج اکبر کا زمانہ کہ جسمیں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف سے منادی کر دی گئی ہے۔ کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکین مکہ سے بری الذمہ ہو چکا ہے۔

یہ اعلامیہ گو اولین حج کے موقع پر باقاعدہ، حکومتی اعلان کے طور پر سنایا گیا مگر روایات سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی یوم اعلان کو تسلسل و دوام بھی بخشا۔

عن ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہ ان رسول اللہ ﷺ وقف یوم النحر بین الجمرات فی الحجة التی حج فقال ای یوم هذا؟ قالوا یوم النحر قال هذا یوم الحج الاکبر۔ (۳)

حضرت ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ نے حج ادا کیا تو یوم النحر (یعنی قربانی والے دن) جمرات کے درمیان کھڑے ہوئے اور صحابہ سے پوچھا کونسا دن ہے؟ انہوں نے کہا یوم النحر ہے آپ نے فرمایا یہ یوم حج اکبر ہے۔

یاد رہے کہ جس لمحہ موجود میں رسول اللہ ﷺ یہ ارشاد فرما رہے تھے وہ لمحہ ایام الاسبوع کے اعتبار سے ہفتہ کا دن تھا نہ کہ جمعہ کا۔

آپ ﷺ کا اسلام کے دوسرے اور اپنے پہلے اور آخری حج کے موقع پر اسے یوم الحج الاکبر سے تعبیر کرنا دراصل یوم کی وسعت کو ثابت کرتا ہے۔ نہ کہ اسکی محدودیت کو۔ اس لیے ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ قرآن کے بیان کردہ یوم کو، یوم النحر یا یوم العرفہ میں مخصوص و مقید کرنا، یا اسے یوم الجمعہ سے مشروط کرنا، یوم حج اکبر کی آفاقیت کو محدود کرنے اور خود حج اکبر کے امتیازی وصف کو ختم کرنے کے مترادف ہے مزید برآں یہ کہ حج اکبر کو جمعہ کے ساتھ بریکٹ کرنے اور پھر اسے ستر حج کے برابر سمجھنے کی بحثیں، قرآن مجید کے تصور یوم الحج الاکبر کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ تفسیر نعیمی، جلد دہم، ص ۱۵۱، مفتی احمد یار خان نعیمی، ناشر نعیمی کتب خانہ، مفتی احمد یار خان روڈ، گجرات، سنہ اشاعت درج نہیں

۲۔ الجامع الصحیح للبخاری، امام ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری، باب نمبر ۵۰۷، رقم الحدیث ۱۷۳۷، ناشر فرید بک اسٹال، اردو بازار، لاہور، طبع سوم ۲۰۰۲ء

۳۔ الجزء العاشر، ص ۷۴، مکتبہ امدادیہ ملتان، سنہ اشاعت درج نہیں

۴۔ تفسیر روح المعانی، ص ۴۶، الجزء العاشر، مکتبہ امدادیہ ملتان

....